www.KitaboSunnat.com
مولانا ابوالکلام آزاد
نے
پاکستان
کے
بارے میں کیا کہا؟
PAKISTAN
INDIA
مرتب
احمد حسین کمال

جامعہ بیت السلام (رجسٹرڈ)

کتاب نمبر ______

مولانا ابوالکلام آزاد

نے

پاکستان کے بارے میں کیا کہا؟

مرتب

احمد حسین کمال

مکتبہ جمال

تھرڈ فلور حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

نام کتاب .... مولانا ابوالکلام آزاد نے پاکستان کے بارے میں کیا کہا؟

مرتبہ .... احمد حسین کمال

اہتمام .... میاں عدیل احمد کھٹانہ

ناشر .... مکتبہ جمال ○ لاہور

مطبع .... تایا سنز پرنٹرز ○ لاہور

سن اشاعت 2008ء

قیمت 100روپے

....

ملنے کا پتہ:

تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون: 7232731 Mob: 0300-8834610

Email: maktabajamal@yahoo.co.uk

maktaba_jamal@email.com

فہرس

عنوانات

میری پوری زندگی، ایک کھلی کتاب ہے!

میں بے غرض ہوں، اور جو بے غرض ہوتا ہے، بے پناہ ہو جاتا ہے۔

آپ سمجھے!

بے پناہ کون ہوتا ہے؟

نہیں!

آپ نہیں سمجھے،

میں بتاؤں!

بے پناہ وہ ہوتا ہے، جسے کوئی تلوار کاٹ نہیں سکتی۔

انڈین پارلیمنٹ میں

فرقہ پرست ہندوؤں سے

مولانا آزاد کا خطاب

"کسی بھی پارلیمنٹ ہاؤس میں کبھی بھی اس سے زبردست تقریر مشکل سے کی گئی ہوگی!"

انگریزی اخبار سٹیٹسمین نئی دہلی کا تبصرہ

وضاحت

اِس کتاب کے مندرجات کی حیثیت ایک تاریخی ورثہ کی ہے۔ مُسلمان مِلّت کے لیے، ماضی کے تمام اکابر، اپنے اختلافِ فکر و نظر کے باوجود ایسا اثاثہ ہیں، جس پر مُسلمان* مِلّت کے اجتماعی وُجود کی اساس قائم ہے۔

مولانا نذیر حسین دہلوی، مولانا محمّد قاسم نانوتوی، مولانا فضلِ حق خیر آبادی، سرسیّد، ابوالکلام، شیخ الہند، اقبال، مولانا محمّد علی جوہر، ظفر علی خاں، مولانا عبیداللہ سندھی، عطاءاللہ شاہ بخاری مولانا مدنی اور قائدِ اعظم ایسی شخصیتیں تھیں، جن کی چھاپ برطانوی ہند کے مسلمانوں کی حالیہ تاریخ پر اِتنی گہری ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی بھی نفی کرنے سے، یہ مِلّی ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔

جس طرح پاکستان کی تاریخ کی تشکیل میں ہم، لیاقت علی خان، مولانا عثمانی، مولانا احمد علی لاہوری، سہروردی، مودودی صاحب، ایّوب خان، مفتی محمود، ولی خان، مولانا نورانی، مجیب، بھاشانی، بھٹو صاحب، مولانا غلام غوث، اور اصغر خان میں سے کسی کی نفی نہیں کر سکتے۔

(۱۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء)

کمال

جو ————

مولانا ابو الکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر و ہم نوا تھے۔

جن کی ————

بے لوث ملی خدمت، بے غرض دینی جدوجہد اور بے داغ انقلابی کردار، کے نقوش اسلام اور وطن کی تاریخ میں جاوداں بن چکے ہیں۔

اور، جن کی ————

عظیم جدوجہد کی یاد سے آئندہ نسلیں، قرنہا قرن تک فیض یاب ہوتی رہیں گی ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دِلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

نہیں منّت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری

۲۵ سال بعد، پاکستان کی تاریخ ہی نہیں، بلکہ برِصغیر کی تاریخ بدلنا شروع ہو گئی ہے، اور اِن ۲۵ سالوں میں جنوب ایشیا کا سیاسی نقشہ یکسر بدل چکا ہے۔

برِصغیر اور پاکستان کی حالیہ تبدیلیوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد کو تازہ کر دیا ہے ___ آج بیشتر زبانوں سے یہ جملہ سُننے میں آ رہا ہے کہ:

★ مولانا ابوالکلام نے جو کچھ کہا تھا، وہ سب کچھ درست ثابت ہو رہا ہے۔

اور ہر شخص کو جستجو ہے کہ وہ سب کچھ جان لے، جو مولانا آزاد نے پاکستان اور ہندوستان یا بالفاظِ دیگر برِصغیر کے مُسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں کہا تھا

یہ بات تو دوست دشمن ، اپنوں و پرایوں سب ہی کو تسلیم ہے کہ مولانا ابوالکلام کی شخصیت برِصغیر ہی میں نہیں بلکہ ایشیا بھر میں، علمی اور سیاسی اعتبار سے منفرد و یکتا اور بلند و بالا سمجھی گئی ہے اور مغرب کے مقابلہ میں ان کی ذات کو مشرق کی عظمت و برتری کی علامت

کہا گیا ہے۔

با ایں ہمہ پاک و ہند کے مسلمانوں میں ان کا سیاسی موقّف و مَسلک متنازعہ فیہ رہا ہے، اور موافقانہ و مخالفانہ انداز میں ان کے موقّف و مَسلک پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ لیکن :

★ ایک بات پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ عصرِ حاضر میں اسلام کے سب سے بڑے شارح اور ترجمان تھے، اور مشرق کی غلام قوموں و مُسلمان ملّت کی آزادی کے اوّلین نقیب، اور سب سے بڑے داعی تھے۔

پاکستان کے مُسلمان آج ایک نہایت ہی شدید ذہنی کرب و اضطراب اور فکری اندوہ اور تشویش کے دَور سے گذر رہے ہیں، ان کی تمام اُمیدیں ایک ایک کرکے مسمار ہو چکی ہیں، صرف ۲۵ سال کے مختصر عرصے میں وہ اپنے وطنی وجود کا نصف حصّہ کھو چکے ہیں، اور باقی نِصف حصّہ میں علاقائی افتراق کے خطوط کو اُبھرتا دیکھ رہے ہیں۔ برِّصغیر کے مُسلمانوں کی ملّی وحدت کے وجود کا جو نظریاتی ہیکل انھوں نے تعمیر کیا تھا، وہ تقسیم در تقسیم کے پیہم تاریخی اور سیاسی عمل کے ذریعہ پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ قائدِ اعظم نے جو حصّہ زمین انھیں لے کر دیا تھا، وہ اسے بھی متّحد نہیں رکھ سکے۔

اِس سلسلے میں سب سے زیادہ ذہنی اور جسمانی صدمہ اُن مسلمانوں کو پہنچا ہے، جو ہندو

اکثریت کے صوبوں میں آباد تھے، اور حصولِ پاکستان کی جنگ میں سب سے پیش پیش تھے ــــــ!!

تقسیمِ ہند کے بعد وہ لاکھوں کی تعداد میں، اپنا پیدائشی وطن ترک کرنے پر مجبور ہوئے، اور اب ۲۵ سال کی خانہ ویرانی و خانہ بدوشی کے بعد، مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی و خاتمہ کے سانحہ نے ان کے مستقبل کو ایک بار پھر بے یقینی بنا کر رکھ دیا ہے۔ آج جس سرزمین پر ان کے پیر ہیں، وہ سرزمین بھی ان کو اپنے پیروں تلے سے نکلتی معلوم ہو رہی ہے۔

غرض کہ آج ان کی قیادت و امامت کے وہ تمام بُت ایک ایک کرکے ٹوٹ چکے ہیں، جن کی جاذبیت نے عرصۂ دراز تک، ان کے دل و دماغ کو ہیجان انگیز سیاسی اور مذہبی سحر کے طلسم میں جکڑے رکھا تھا اور جن کی پرستش میں وہ ایسے کھوئے گئے تھے کہ اپنے گردوپیش کا انہیں ذرا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔

تاآں کہ وقت کے طوفانوں اور سیلابوں کی یورش نے ان کے خوابوں کی ساری متاع موجِ حوادث کے ایک ہی ریلے میں بہا کر رکھ دی۔

آج وہ اپنے ماضی پر نالاں، اپنے حال پر گریاں، اور اپنے مستقبل کے بارے میں پریشان ہیں، اور ایسے مقام پر کھڑے ہیں، جہاں سے کسی منزل کی طرف کوئی راہ نہیں جاتی۔

ان کے یقین و اعتماد کی رُوح پارہ پارہ ہو گئی ہے، اور سالہا

سال کے سنہرے خواب سراب ثابت ہوئے ہیں۔

- آج وہ اپنے وجود کے تحفظ کے لئے فکرمند ہیں۔
- آج وہ اپنے دین کے تحفظ کے لئے فکرمند ہیں۔
- آج وہ اپنے عقیدہ اور ایمان کے تحفظ کے لئے فکرمند ہیں۔
- آج انھیں اپنے کھوئے ہوئے یقین و اعتماد اور عزم و حوصلہ کی تلاش ہے۔

اور وہ جاننا چاھتے ھیں کہ ابوالکلام کے افکار کی مسیحائی میں ان کی موجودہ مہلک بیماری کا بھی کوئی تیر بہدف علاج موجود ھے۔؟

رومیوں نے بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت کو سختی کے ساتھ مسترد کردیا تھا ــــــ اور حضرت مسیحؑ پر رومی زبان کی تمام گالیاں، ہر قسم کا استہزاء اور ستم رانی کا ہر حربہ استعمال کر ڈالا تھا ــــــ حتیٰ کہ بات صلیب تک جا پہنچی تھی۔

لیکن پھر دو سو سال بعد وہی رومی، اپنے ظالمانہ رویّہ پر پچھتائے حضرت مسیحؑ کی دعوت کو ان کے بعد لبیک کہا، اور ان کے ایسے پیروکار بنے کہ مسیحی روم کے جھنڈے یورپ کے آخری سرے تک گاڑ دیئے ــــــ! تاریخ آج تک روم کی اس عظمت کے آثار و باقیات کی حفاظت کرتی چلی آرہی ہے۔

کیا اب وہ وقت نہیں آگیا ہے کہ برِّ صغیر کی مسلمان ملّت ۲۵ سال کی محرومیوں اور ذلّتوں کے بعد، اپنے مسترد کئے ہوئے مسیحائے ملّت کی فکر و دعوت کی طرف رجوع کرے؟ اور تاریخ کے ایک نئے دور کا سنگِ بنیاد رکھ دے؟
وقت کو، اِس سوال کے جواب کا اِنتظار ہے —— !

اسعد حسین کمال

جمیعتہ اکادیمی سی ۱۵۳
کورنگی ۲ - کراچی ۳۱

(۲۱ر اکتوبر ۱۹۷۳ء - کراچی)

انسانیت کا نقصان

اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اُتر آئے، اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہوکر اعلان کردے کہ سُوراج چوبیس گھنٹہ کے اندر مِل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندوستان، ہندو مُسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے —— تو میں سُوراج سے دَست بَردار ہوجاؤں گا۔ کیوں کہ اگر سُوراج کے ملنے میں تاخیر ہُوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالمِ انسانیت کا نقصان ہے۔
(۱۹۲۴ء میں ایک خطاب)

٭ کون تھے؟ اور

٭ کیا تھے؟

دُنیا کو ہے اُس مہدیِ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار!

• اقبالؒ •

۱

تعارف کراتے ہیں:

*	خواجہ حسن نظامی	اُردو زبان کے مشہور ادیب اور صُوفی
*	علامہ سلیمان ندوی	ہندوستان کے مشہور عالم
*	جان گنتھر	مشہور امریکی اہلِ قلم
*	ملّا واحدی	دہلی کے مشہور ادیب
*	چراغ حسن حسرت	ادیب اور اہلِ قلم
*	جواہر لال نہرو	وزیر اعظم ہند
*	مہا دیو ڈیسائی	سیکرٹری گاندھی جی
*	نیاز فتحپوری	مشہور ادیب
*	عبدالرزاق ملیح آبادی	مشہور اہلِ قلم
*	ڈاکٹر بی، وی، کیسکر	ماہر تعلیم اور وزیر ہند
*	شورش کاشمیری	مدیر "چٹان"

"سَرو قد، دوہرا بدن، گورا رنگ، ایرانی وضع کی بڑی بڑی آنکھیں، کتابی چہرہ، سفید چھوٹی ڈاڑھی، آواز سُریلی اور بلند' مزاج میں تمکنت اور وقار، طبیعت میں شوخی و ظرافت۔

دہلی کے رہنے والے ہیں، ایک بڑے پیر کے بیٹے ہیں، مگر پیری مُریدی کے زیادہ دِل دادہ نہیں ہیں!

قوم سیّد، پیشہ آزادی اور بے نیازی، حافظے کی قوت بے مثال ــــ تصور کی طاقت، چیونٹی کی ناک اور چیل کی آنکھ سے بڑھی ہوئی، تقریر و تحریر کے خود مختار بادشاہ، نازک مزاجی میں تاناشاہ' ــــ سیاست دانی میں ہر ہندو مسلمان سے سو قدم آگے ــــ!!

بیرونِ ہند کے مسلمانوں میں اور امریکنوں اور انگریزوں میں بھی مقبول ہیں ــــ!

یورپین مورخ سوچتے رہتے ہیں کہ ان کو یوروپین کیونکر ثابت کیا جائے ــــ!!!

صفت ابوالکلام چالیس کروڑ باشندوں میں، ایک ایسے ہندوستانی ہیں' جو یورپ کی سیاست کو........ سمجھتے بھی ہیں' اور اُس کے وار کو بغیر ڈھال کے روکتے بھی ہیں، اور مسکرا کر ایک نکیلا سیاسی نشتر

حریف کو مارتے جاتے ہیں، اور کہتے جاتے ہیں — غالباً کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہوئی ہوگی — یہ انجکشن آپ کی بیماری کے لیے بہت ہی مفید ہے — !

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک راز دار دوست سے کہا، کہ جب مولانا ابوالکلام اور سر کرپس کی گفتگو کا میں ترجمہ کر رہا تھا، تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ مولانا ایسی گرفت سوالات کے ذریعے کرتے تھے کہ سر کرپس جواب سوچتے رہ جاتے تھے۔

قرآن مجید پر ایسا عبور ہے، اور اس کے مقاصد کو اتنا زیادہ سمجھتے ہیں کہ مصر و شام کے علماء جدید بھی شاید اتنا نہ سمجھتے ہوں گے۔

ہوش سنبھالتے ہی مسلم لیگ کو سمجھ لیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں مسٹر زاہد سہروردی کے مکان پر انھوں نے حسن نظامی کو ایک کاغذ پر یہ لکھا تھا:

"سب باتیں منظور ہیں باستثنائے شرکتِ مسلم لیگ!"

"معاف فرمائیں، اگر میں کہوں کہ اسلام ہندوستان میں آکر اور تمام مقامات سے بہت زیادہ مسخ ہوا۔ ابھی ہندوانہ رسم و رواج کے بت سے نجات نہیں ملی تھی کہ تقلیدِ فرنگ کا ایک نیا بت کدہ آباد کر دیا گیا؟"

(الہلال ۱۹۱۳ء ۔ ایک خط کے جواب میں)

رانچی کا نظر بند

علامہ سلیمان ندوی

اگر ہمارے نظر بندوں میں کوئی ایسا ہے جو اسوۂ محمدیؐ پر فائز ہوا (شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی طرف اشارہ ہے) تو ہم میں ایک اور ہستی ایسی ہے جو اسوۂ یوسفیؑ کے درجہ پر ممتاز ہوئی، جس عزم و استقلال استغناء اور قوتِ ایمانی کے ساتھ مولانا نے یہ زمانہ بسر کیا ہے وہ آئمہ سلف کی یاد کو تازہ کرتا ہے شاید سب کو معلوم نہ ہو کہ انھوں نے حکومت کا وظیفہ لینے سے انکار کر دیا اور اعانت نظر بنداں کا ماہوار عطیہ بھی قبول نہیں کیا۔ اس زمانے میں ان کو جو مالی وقتیں پیش آئیں وہ صرف عبادی الشکور کے رمز میں پنہاں ہیں۔ یہ معلوم ہو گا کہ رات کو انھیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس بناء پر وہ نمازِ عشاء کی جماعت میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اسے گوارا نہ کیا انھوں نے حکومت سے اجازت چاہی اور جب کوئی جواب نہ ملا تو برملا اعلان کر دیا کہ فریضۂ الٰہی میں انسانوں کے فرمان مانع نہیں آسکتے! آہ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو آزادی کے بستر پر بھی اٹھ کر خدا کے آگے سر نہیں جھکاتے اور ایک وہ عباد صالحین ہیں جو قید و تنگی میں بھی مساجدِ الٰہی کی یاد فراموش نہیں کر سکتے!

رانچی ایک ایسا مقام تھا جہاں مسلمان نہایت ذلت و نکبت کی حالت میں تھے جہالت اور باہمی خانہ جنگی نے ان کو گردوپیش کے حالات سے ناواقف کر رکھا تھا۔ عیسائی مشنریوں کا جال ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ عالم دین کا وجود اس خطہ پر نہ تھا۔ مذہبی احساسات کی روح ان میں مُردہ تھی لیکن مولانا کے پرتو صحبت نے چند ہی سال کے بعد وہاں کی زمین و آسمان کو ملا دیا۔ اب ہم وہاں "اسلامی انجمن" کا نام سنتے ہیں۔ ایک مدرسۂ اسلامیہ کی بنیاد دیکھتے ہیں۔ علماء و مشاہیر کے مواعظِ حسنہ کا وہاں جلوہ نظر آتا ہے۔ مذہب و ملت کی رُوح کو اُن کے جسم و تن میں گردش کرتے ہوئے پاتے ہیں اور وہاں کے فقراء اور خاک نشینوں میں اب یہ حوصلہ دیکھتے ہیں کہ علم کا پہلا کعبہ اس دیار میں وہ خود اپنے زورِ بازو سے قائم کر کے رہیں گے جہاں ایک عالمِ دین کا وجود نہ تھا وہاں اب یہ کوششیں ہو رہی ہیں کہ سینکڑوں علماءِ دین اس خاک سے پیدا ہو کر اس سرزمین کو منور کریں جہاں مسجدیں بے چراغ تھیں وہاں ایک خورشید سے دیر و حرم میں اجالا ہو گیا۔

زمانہ قیام رانچی میں ایک سال تک جامع مسجد میں مولانا نے مسلمانوں کو قرآن مجید کا درس دیا۔ زیادہ تر اوقات تالیف و تصنیف میں بسر ہوئے "ترجمان القرآن" اسی زمانے میں ختم ہوا۔ "البیان" تفسیر قرآن میں ایک جامع تصنیف کا سلسلہ ۲۳ پاروں تک پہنچا۔ فقہ اسلامی پر بغیر فریقانہ تعصب کے صرف کتاب و سنت کو پیش نظر رکھ کر متعدد رسائل "الصلوٰۃ"، "الزکوٰۃ"، "الحج"، "النکاح" ترتیب دیئے۔ سوانح مجددین کا سلسلہ شروع کیا۔ اور اس میں علامہ ابن تیمیہؒ، علامہ ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے سوانح

قلمبند کئے۔ ایک رسالہ منطق اور بعض دوسرے عنوانات علمی پر تحریر کیا۔ ان سطروں کو لکھتے وقت مجھے دھوکا ہوا ہے کہ میں خود امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ یا شمس الائمہ سرخسی اور امیہ بن عبدالعزیز اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں!

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام کے "الہلال" و "البلاغ" نے پیدا کیا اور جس اسلوب بلاغت کمال انشاپردازی اور زورِ تحریر کے ساتھ انھوں نے انگریزی خوان نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا اس نے ان کے لئے ایمان اور یقین کے نئے نئے دروازے کھول دئیے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی و وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔ ضرورت تھی کہ اسی مؤثر قلم سے قرآن پاک کی پوری تفسیر شائع ہو تاکہ عربی سے نابلد مسلمانوں کے لئے نور بخش اور افزائش بصیرت کا سروسامان اُردو میں میسّر آئے۔

۱۹۱۲ء کے شائقین کا اصرار تھا اور خود مولانا کی بھی خواہش تھی کہ وہ قرآن پاک کا ایک ترجمہ اور ایک تفسیر لکھیں۔ چنانچہ نظربندی کے زمانے میں آپ نے تفسیری ترجمہ کی طرف توجہ کی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ بڑی تفسیر لکھنے کا خیال بھی ان کے دل سے محو نہیں ہوا۔ لیکن جنگِ عظیم کے اعلان کے بعد سیاسی دارو گیر کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے ان کے جیسے آزاد کو بارہا گرفتار اور بارہا آزاد کیا۔ اس سلسلۂ قید و حبس میں ان کے کاغذات مسوّدات بھی بارہا نظربند ہوئے۔ آخر ان پے درپے حوادث کی بادِ تند نے ان اوراق کو پراگندہ اور منتشر کر دیا!

مصنف کو جب کبھی جیل کے اندر یا باہر یکسوئی نصیب ہوئی اس نے ان اوراقِ پریشاں کو از سرِ نو مرتب کرنا شروع کر دیا اور عجب نہیں کہ مولانا حالی کا یہ شعر اس وقت ان کی زبان پر ہو :-

میں آج بیٹھا ہوں ترتیب دینے دفتر کو
ورق ہی جب کہ اڑا لے گئی ہوا ایک ایک

بہر حال وہ مبارک وقت آیا کہ مولانا آزاد نے اپنے ترجمہ و تفسیر کی پہلی جلد "ترجمان القرآن" مرتب کر کے شائع کی۔ اس جلد میں سورۂ فاتحہ کی مکمل تفسیر اور سورۂ بقرہ، آلِ عمران، نساء، مائدہ اور انعام پانچ سورتوں کا (جو آٹھ پاروں پر مشتمل ہیں) تفسیری ترجمہ ہے۔ مصنف "ترجمان القرآن" کی یہ دیدہ وری داد کے قابل ہے کہ انھوں نے وقت کی روح کو پہچانا اور فتنہ فرنگ کے عہد میں اس طرز و روش کی پیروی کی جس کو ابنِ تیمیہؒ اور ابنِ قیمؒ نے فتنہ تاتار میں پسند کیا تھا۔

"ترجمان القرآن" وقت کی اہم چیز ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو گھر گھر پھیلایا جائے اور نوجوانوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دی جائے!

مولانا آزاد کی عمر پچاس کے قریب ہوگی۔ وہ ایک ممتاز مفکر اور مسلم عالم دین ہیں اور یقیناً دنیائے مشرق کے بہت بڑے علماء و فضلاء میں سے ایک ـــ وہ کتابوں کے کیڑے، صاحب فراست، عالم متجر اور قرآن حکیم پر ایک جدید مگر بہترین تفسیر کے مصنف ہیں!

" یہ محیر العقول اور نادرِ روزگار شخصیت پندرہ سال کی چھوٹی سی عمر میں ہی فارسی، عربی اور دینیات کی سنجیدہ اور متین شخصیت بن چکی تھی!

" مولانا راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود مذہبی عقائد کی تحقیق و تدقیق میں جدت پسند ہیں اور پھر موجودہ (اسلام کی طرف) ان کا رویہ بھی تجدیدی اور اصلاحی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو قومی تحریک کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ اور وہ ان معدودے چند ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے گاندھی جی کے میدان میں آنے سے پہلے یہ اہم تحریک شروع کی تھی۔

۱۹۱۳ء میں انہیں انقلابی سرگرمیوں کی بناء پر نظربند کر دیا گیا تھا۔ جب ۱۹۲۰ء میں رہا ہوئے تو تحریک عدمِ تعاون کی سرگرمیوں میں بے طرح مشغول ہو گئے۔

۱۹۲۳ء میں انھیں کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا اور کانگریس کی ساری تاریخ میں وہ سب سے کم عمر صدر تھے۔

مولانا کی یکتائے روزگار خصوصیت اُن کی شخصیت میں دینی روایاتِ عالیہ اور نظریاتِ جدیدہ کا حیرت انگیز ربط و ضبط اور ترتیب و تدوین ہے! انھیں بجا طور پر شہنشاہِ علم و فضل کہا جا سکتا ہے!"

مسلمان عوام کی نفسیات

افسوس! کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے، تم نمائش کے پجاری، شور و ہنگامے کے بندے، اور وقتی جذبات و انفعالِ ہیجان کی مخلوق ہو ___ تم میں نہ استبداد ہے، نہ نظر ___ نہ تم جانتے ہو، نہ پہچانتے ہو ___ تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ہو، اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی کر جاتے ہو ___ تمھاری اطاعت جس قدر سہل ہے، اور تمھاری ارادت جتنی سستی ہے، اُتنا ہی تمھارا انحراف آسان ہے ___ پس نہ تو تمھاری تحسین کی کوئی قیمت، نہ تمھاری توہین کا کوئی وزن ___ نہ تمھارے پاس دماغ ہے، نہ دل ___ وساوس ہیں جن کو تم افکار سمجھتے ہو ___ خطرات ہیں جن کو تم عزائم کہتے ہو۔! تمھارا بتلاؤ! میں تمھارے ساتھ کیا کروں۔" (ایک خطاب سے اقتباس)

قرآنی سیاست کا ماہر!

مُلّا واحدی

" امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ مکۂ معظمہ میں پیدا ہوئے - اور ہندوستان آ کر بھی دِلی سے باہر رہے - لیکن ان کے والد حضرت مولانا خیرالدین دہلوی تھے - پنڈت کے کوچہ میں رہتے تھے - مولانا ابوالکلام آزاد خود شروع شروع میں اپنے نام کے ساتھ دہلوی لکھا کرتے تھے ...... مولانا ابوالکلام کے بڑے بھائی مولانا ابونصر آہ بھی دہلوی لکھتے تھے -
لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کو دِلی والوں میں شامل نہ کروں اور دِلی کو اس شرف سے محروم رکھوں کہ اسے مولانا جیسے فاضل ادیب ، مقرر اور مدبر سے نسبت ہے -

- -

مولانا ابوالکلام ، سید عبدہ مصری اور جمال الدین افغانی کی صف کے فاضل ہیں - فارسی کی مثل ہے " یک من علم را دہ من عقل درکار است " - مولانا کے پاس دس من عقل نہیں سو من عقل موجود ہے -
تحریر و تقریر کے مولانا بادشاہ ہیں - ان کے اخبار " الہلال " کا مسلمانانِ ہند کو جگانے میں سب سے زیادہ حصّہ ہے اور جس انداز سے انھوں نے سوتوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگایا تھا ، اس انداز سے جھنجوڑنا دوسرے کے لئے ممکن نہیں - ان کی زبان اور ان کا طرزِ بیان

کوئی کہاں سے لائے گا؟

معلوم ہوتا تھا کہ عرش کا پایہ پکڑ کر کہہ رہے اور بول رہے ہیں۔

تقریر میں مولانا" اور بیڑی" کرتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں ایک بوڑھے اور تجربہ کار شخص عبداللہ خان دلی کے سپرنٹنڈنٹ سی، آئی، ڈی، تھے۔ میرے مکان سے ملا ہوا ان کا مکان تھا۔ انھوں نے ایک دفعہ مجھ سے کہا:۔

• ابوالکلام تقریر نہیں کرتے جادو کرتے ہیں۔ جس دن چاہیں غدر کرا سکتے ہیں! •

ایک پولیس والے کے نزدیک کسی کی اہمیت کا اس سے بڑا معیار نہیں ہو سکتا!

غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں میں جو تھوڑا بہت شعور آ گیا تھا اس شعور کے بیدار کرنے والوں میں مولانا کا نام امتیاز خاص رکھتا تھا۔

تدبر اور سیاست دانی کی یہ کیفیت ہے کہ آج سے بیس برس پہلے ایک ذمہ دار بزرگ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے مندرجہ ذیل الفاظ سنائے تھے:۔

• میں صرف عملی سیاست ہی نہیں جانتا، سیاست کا سکالر بھی ہوں۔ سیاست کی کتابیں مجھ سے زیادہ ہندوستان میں اوروں نے نہیں پڑھیں۔ پھر تیسرے چوتھے سال میرا یورپ کا پھیرا بھی ہو جاتا ہے۔ جہاں سیاست کی رفتار قریب سے دیکھنے میں آ جاتی ہے اور

میں سمجھتا ہوں کہ مجھے سیاست کا تازہ ترین علم حاصل ہو گیا ہے۔ لیکن جب ہندوستان پہنچ کر مولانا ابوالکلام سے باتیں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب بھی آگے ہیں! ●

اس روایت کے راوی سے میں نے کہا:-

"کیا آپ جانتے ہیں کہ اس کی وجہ کیا ہے؟"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ پنڈت جی انسانوں کی تراشیدہ سیاست کے ماہر ہیں اور مولانا قرآنی سیاست کے ماہر ہیں!"

● قرآنی سیاست میں طرح طرح نہیں ہے۔ لا تبدیل لکلمات اللہ! ●

● یقینِ محکم ●

"میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں۔ اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں جب پیاسا تھا تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں اور جب سیراب ہوا، تو میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہِ عام پر نہ تھا"

● مقدمہ ترجمان القرآن ●

"میں پہلی مرتبہ شملہ میں مولانا سے ملا تھا۔ ایڈورڈ گنج میں ان کی تقریر سنی۔ تقریر مکمل ہو چکی تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن چند منٹ کی ملاقات تھی اور ملنے والوں میں ایک میں ہی نہیں تھا، بہت سے لوگوں کا ایک وفد سا تھا۔ لوگ سوال کر رہے تھے اور وہ جواب دے رہے تھے۔ اس وقت ان کی صورت شکل کے عام انداز سے ان پر عقاب کا دھوکا ہوتا تھا۔ لیکن ایسا عقاب نہیں جو محض شکاریوں کا بازیچہ ہو بلکہ ایسا عقاب جو سنگ خارا کی چٹانوں میں آشیانہ بناتا ہے۔"

"میرے دل پر مولانا کی جس خصوصیت کا اثر سب سے زیادہ ہے وہ ان کی ذہانت اور علمی تبحر ہے۔ فارسی، عربی میں تو ان کی فضیلت مسلّم ہے۔ انگریزی انہوں نے علی پور جیل میں پڑھی تھی اور ان کے انگریزی پڑھنے کا بھی یہ حال تھا کہ کنگ پرائمر کے چند صفحے سبقاً پڑھے اور چھوٹی موٹی کتابیں اور اخبار دیکھنے لگے۔ تھوڑے عرصہ میں ہی یہ کیفیت ہو گئی کہ انگریزی کی بڑی دقیق کتابیں پڑھنے اور ان کا مطلب سمجھنے لگے۔ 'الہلال' دوسری مرتبہ نکلا تو اس کے لئے خود انگریزی کے ایک آدھ مضمون کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ اس قدر پاکیزہ ہے کہ اسے دیکھ کر ان کی خداداد صلاحیت پر حیرت ہوتی ہے۔"

* ایک دفعہ میں نے افسانہ نگاری کے متعلق انہیں اپنا ایک مضمون دکھایا، پڑھ کر کہنے لگے : "تم نے فلاں فلاں فرانسیسی قصہ نویسوں کا ذکر نہیں کیا۔ حالاں کہ ان کے تذکرہ کے بغیر اس موضوع پر کوئی مضمون مکمل نہیں ہو سکتا!" پھر افسانہ نگاری کے متعلق ایک تقریر شروع کر دی اور اس سلسلہ میں ایسے ایسے مصنفوں اور ان کی تصانیف کا ذکر کر گئے جن کے نام ہی میں نے نہیں سُنے تھے!

پٹنہ میں بڑی دھوم سے طبی کانفرنس ہوئی۔ غالباً حکیم مسیح الملک (اجمل خان) اس کے صدر تھے۔ چوں کہ مولانا آزاد بھی اتفاق سے وہیں (پٹنہ میں) موجود تھے اس لیے بعض طبیبوں نے ان سے استدعا کی کہ آپ کانفرنس میں طب یونانی کے متعلق چند کلمات کہہ دیجیے۔ حکیم اجمل خان مرحوم نے بھی سفارش کی۔ لیکن مولانا (ابوالکلام آزاد) تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو پورے دو گھنٹے طب قدیم اور طب جدید کے نظریوں اور طریق علاج وغیرہ پر بحث کرتے رہے۔ حکیم نثار احمد صاحب نے جو کلکتہ کے مشہور طبیب ہیں اور اس اجتماع میں موجود تھے خود مجھ سے بیان کیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تقریر میں جو باتیں بیان فرمائیں وہ بڑے بڑے نامور طبیبوں کو بھی معلوم نہیں!"

* ان کے (مولانا ابوالکلام آزاد کے) والد بزرگوار مولانا خیر الدین ایک مشہور خانوادۂ طریقت سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ اب بھی ان کے عقیدتمند ملک کے مختلف حصوں میں موجود ہیں لیکن مولانا ابوالکلام ..... نے پیری مریدی سے کوئی سروکار نہیں رکھا!

* مولانا پر بڑے بڑے کڑے وقت بھی آتے ہیں لیکن اس غیرت کے پُتلے

نے کبھی کسی کا احسان نہیں اٹھایا۔ ان کے والد بزرگوار کے مریدوں میں بہتیرے لوگ ایسے ہیں جو اپنا سب کچھ انہیں دے ڈالنے کو تیار ہیں۔ ان کے بعض عقیدت مندوں نے جو "الہلال" کے دورِ اول سے آج تک ان کے مداح چلے آتے ہیں، کئی مرتبہ ان کی مالی اعانت کرنا چاہی لیکن انھوں نے گوارا نہیں کیا۔ ان میں سے اکثر لوگوں نے بڑی بڑی رقموں کے منی آرڈر اور چیک بھیجے جو واپس کر دیئے گئے!"

عُلماءِ سُو

"سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے۔ لیکن علماءِ دنیا پرست کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے، لیکن اِدھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور اُدھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے ـــــ یہ ہی حال ان سگانِ دُنیا کا ہے۔ ان کا سرمایۂ ناز "علمِ حق" نہیں ہے۔ جو تفرقہ مٹاتا اور اتباعِ سبلِ متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے، بلکہ یکسر علم جہل و خلاف ہے ـــ نفس پرستی اس کی کثافت کو غیرت دیتی، اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز تر کرتی رہتی ہے۔" ـــــــــــ (ایک تحریر سے اقتباس)

* * *

کانگریس کے اہم فیصلوں میں آپکا ہاتھ کارفرما رہتا تھا

• جواہر لال نہرو •

تقریباً بائیس برس ہوئے جب پہلے پہل میری ملاقات مولانا سے ہوئی۔ لیکن مولانا کی علمیت قومی کاموں میں عزم و ثبات اور جنگ عظیم کے دوران میں آپ کی نظربندی کے متعلق ــــ اس سے پیشتر بہت کچھ سن چکا تھا اور آپ سے ملنے کے لئے بیتاب تھا!

پچھلے دس بارہ سال سے مجھے آپ سے بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ اگر ہمارے ایام قید و بند اور میری ہندوستان سے غیر حاضری کے زمانے کو اس سے مستثنےٰ کر دیا جائے تو کانگریس کے روزانہ مشاغل اور اس کی عظیم الشان تجویزوں اور اہم فیصلوں میں مجھے آپ کی مسلسل رفاقت کی عزت حاصل رہی ہے۔ کانگریس کی تجاویز و عزائم کی تراش خراش اور وضع قطع میں آپ کا زبردست ہاتھ ہمیشہ مصروف کار رہا ہے۔ آپ صدر ہوں یا ورکنگ کمیٹی کے ممبر آپ کے مشورے غیر معمولی طور پر وقیع سمجھے جاتے ہیں کیوں کہ ان کے پس پردہ دانش و تدبر اور فہم و فراست کی غیر معمولی پختگی اور گھلاوٹ روز بروز نمایاں تر ہوتی جاتی ہے۔

آپ کی اصلی خصوصیت علم و فضل تھی مگر حالات کی نزاکت نے آپ کو حرکت و گردش کی زندگی پر مجبور کر دیا ہے۔

مولانا کو دیکھ کر مجھے اکثر وہ فرانسیسی قاموسی یاد آجاتے ہیں جو انقلاب فرانس سے کچھ پہلے وہاں موجود تھے۔ تاریخ اقوام ماضیہ میں آپ کا درک و بصیرت یقیناً حیرت انگیز ہے اور پھر یہ وسیع علم آپ کے دماغ میں عجیب ضبط و ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔ آپ کا ذہن مدلل باضابطہ اور سلجھا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے منطق و فلسفہ کے کسی قدیم اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے مجھے ہمیشہ تصنیفی زندگی سے آپ کی بے اعتنائی پر افسوس ہوا ہے کیوں کہ جو زبان آپ لکھتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ پرمعنی الفاظ سے مملو ہوتی ہے وہ جو عنفوانِ شباب ہی میں آپ نے نہ صرف ہندوستان بلکہ مغربی ایشیائی اور عربی ممالک و مصر سے خراجِ تحسین وصول کر لیا تھا محض آپ کے قلم کی بدولت تھا اور اب تک یہ حالت ہے کہ اگر ان عربی بولنے والے ممالک میں کوئی سیاح ہندوستان سے جاتا ہے تو اس سے مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق ضرور دریافت کیا جاتا ہے۔

یہ محض حالات کا تقاضا ہے کہ آپ دوسرے فرائض اور ذمہ داریاں اپنے کندھوں پہ لینے کے لئے مجبور ہو گئے اور اب یہ فیصلہ تاریخ کرے گی کہ آپ نے یہ سب کچھ کس طرح بوجوہ احسن ادا کیا لیکن ہم کہ جنہیں آپ کو بہت قریب سے دیکھنے کی عزت حاصل ہے تاریخ کے فیصلے کے واسطے زحمت کش انتظار کیوں ہوں آپ ہمارے لئے اور ملک و قوم کے لئے قوتوں کا ایک محکم پہاڑ ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ہم نے آپ کی رائے سے اختلاف کیا یا اتفاق! ہم ہمیشہ یہ ملحوظِ خاطر رکھتے رہے ہیں کہ آپ کی رائے بہت زیادہ دقیع ہوتی ہے وہ رائے ایک ایسے آزمودہ کار اور صائب دماغ کی پیداوار ہوتی ہے جسے ماضی و حال کے

علم وفضل اور غیر معمولی دانش وفراست سے نوازا گیا ہو اور یہ ہمہ گیر توتیں بہت کم ہستیوں کا حصہ ہوتی ہیں!

★ گاندھی جی جن کی طرف رجوع کرتے تھے ★

• مہادیو ڈیسائی •

مولانا ابوالکلام آزاد کی بلند قامت شخصیت دیکھ کر حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری مرحوم ایسی شخصیتیں یاد آتی ہیں۔ مولانا کی آنکھوں سے رعب و جلال اور ذہانت کی بجلیاں چمکتی ہیں۔ مولانا کی شخصیت میں اتنا جذب اور کشش ہے کہ آپ کی ہر جگہ تعظیم کی جاتی ہے۔ آپ کے تبحر علمی اور مطالعہ نے آپ کی طبیعت کا رجحان سوچ بچار کی طرف کر دیا ہے اور یہ آپ کے لئے ناممکن ہے کہ عوام میں جا کر ملیں جلیں۔ اس کی وجہ یہ قطعاً نہیں ہے کہ عوام کے لئے آپ کے دل میں ہمدردی نہیں ہے۔ ابھی اگلے ہی دن آپ کھادی پہننے کا مفہوم بتا رہے تھے اور میری خواہش تھی کہ اس موضوع پر آپ گھنٹوں بولتے رہیں۔ آپ نے فرمایا: "سوراج اس وقت تک بے معنی چیز ہے، جب تک کہ یہ غریب اور امیر کی تفریق کو نہیں مٹاتا اور میرے خیال میں کھادی کا عام استعمال ہی یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ہم بھی ان لاکھوں غریب بھائیوں میں سے ہیں جو اس ملک میں بستے ہیں!"

ذہنی لحاظ سے مولانا کانگریس میں اپنی مثال نہیں رکھتے اور اکثر مسائل اور

پالیسیوں کی تشریح اس طریق سے کرتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ کانگریس میں مولانا سے بڑھ کر کوئی معاملہ فہم سیاستدان اور سیاسی جوڑ توڑ کرنے والی دوسری شخصیت نہیں ہے۔ ایک دفعہ آپ ایک پوزیشن قبول کرلیں تو پھر اس کے تمام پہلوؤں کی ایسی وضاحت فرماتے ہیں، کہ اس سلسلہ کا کوئی گوشہ بھی تشنہ نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی سیاسی زندگی کے انتہائی خطرناک مراحل پر ہمیشہ مولانا کی طرف رجوع کرتے ہیں!

کانگریس کے معاملات میں مولانا کی حیثیت ہمیشہ بے مثل اور یکتا رہی ہے انہیں سالہا سال سے یہی حیثیت حاصل ہے اور رہے گی مگر اس کے باوجود آپ ہمیشہ ہر قسم کے عہدے قبول کرنے سے بھاگتے رہے۔ آنجہانی سی آر داس اور پنڈت موتی لال نہرو آپ کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتے تھے۔

مولانا کتابوں کی صحبت اور علمی مشاغل کو بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ آپ علم اللسان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ مولانا بہت بڑے مستشرق ہیں۔ عربی اور فارسی میں تو کوئی بھی آپ کا حریف نہیں ہے مگر جب گفتگو کرتے ہیں تو ایسی آسان اور شگفتہ اور رواں اردو بولتے ہیں کہ ہر کوئی اسے سمجھ سکتا ہے۔ بے شک مولانا کی یہی زبان "ہندوستانی زبان" ہے!

اگرچہ آپ انگریزی بہت کم بولتے ہیں، مگر آپ کی لائبریری انگریزی اور فرانسیسی کتابوں سے بھری ہوئی ہے۔ آپ نے کئی انگریزی شعراء شیکسپیئر، ورڈزورتھ، شیلے اور بائرن کا مطالعہ کیا ہے۔ گوئٹے، اسپنوزا، روسو، مارکس، جیولاک ویلس، ڈیوراں، ہیوگو، ٹالسٹائی اور رسکن کو بار بار پڑھا ہے۔

میں نے مولانا کو سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں دیکھا تھا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا۔ علامہ سید محمد رشید رضا مصری مرحوم جو بعد میں میرے استاد ہوئے مصر سے اجلاس کی صدارت کے لئے تشریف لائے تھے۔ اس موقعہ پر لڑکوں کی انجمن نے غریب طالب علموں کی مدد کے لئے چائے پانی کی دکان ایک تنبو میں کھولی تھی۔

اس دکان میں ایک بوائے میں بھی تھا۔ مولانا آزاد بھی اجلاس میں شرکت کے لئے آئے تھے اور انہی کے ذمّہ تھا کہ علامہ کی تقریر کا ترجمہ سنائیں۔ علامہ کی تقریر کیا تھی، موجیں مارتا ہوا بے پناہ سیلاب تھا۔ دو گھنٹے سے زیادہ جاری رہی۔ مولانا نے تقریر چند ہی منٹ سُنی اور اِدھر اُدھر ہو گئے۔ اب علامہ شبلی نعمانی اور دوسرے منتظمین بدحواس تھے کہ آزاد؟ کہاں غائب ہو گئے۔

مگر ترجمہ کا وقت آیا تو مولانا نے ترجمے کے طور پر اُردو میں ایسی تقریر کی جو علامہ کی عربی تقریر سے روانی، زور، جوش اور درازی میں کچھ سوا ہی تھی اور تمام مطالب پر پوری طرح حاوی۔ سامعین میں کوئی نہ تھا جو فرطِ حیرت سے مبہوت نہ رہ گیا ہو۔

بعد میں مولانا سے میں نے پوچھا تھا کہ بغیر سُنے آپ نے علامہؒ کی تقریر کا ترجمہ کیسے کر دیا تھا؟

ہنس کر فرمایا:

"ابتدائی تقریر سُن کر معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کیا کہیں گے اس لیئے پوری تقریر سننے کی ضرورت نہیں تھی!"

ایک عظیم انسان!

ڈاکٹر بی۔ وی۔ کیسکر وزیر اطلاعات و نشریات ہند

"مولانا سے میری راہ و رسم کوئی بیس برس ہوئے، شروع ہوئی تھی۔ ان دِنوں مولانا اور میں دونوں الٰہ آباد جیل میں تھے۔ میں ہر شام مولانا سے مِلا کرتا تھا کیوں کہ ان کی ملاقات اور مختلف موضوعات پر گفتگو فکر و نظر کو جلاء بخشتی تھی۔ وہ دُنیا کے عظیم سکالروں میں سے تھے۔ وہ بہت بڑے عالم تھے لیکن عجز و انکساری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

مجھے یاد ہے ایک بار میں نے ان کی میز پر فرانسیسی زبان کی بہت سی کتابیں دیکھیں۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ آیا انہیں فرانسیسی ادب سے دلچسپی ہے اور کیا وہ یہ زبان اچھی طرح جانتے ہیں؟

انہوں نے جواب دیا: بس معمولی شُدبُد ہے!

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ فرانسیسی زبان کے بہت بڑے عالم ہیں۔ اور فرانسیسی ادب سے خاصہ شغف رکھتے ہیں۔ وہ عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور فرانسیسی کے عظیم سکالر تھے!

جرمنی، ترکی اور لاطینی زبانوں کے بھی عالم تھے۔ سنسکرت، عبرانی وغیرہ مردہ زبانوں سے بھی انہیں واقفیت تھی!

ہندوستانی زبانوں، بنگالی، مراہٹی، ہندی، مدراسی، پشتو وغیرہ بھی بخوبی

سمجھ لیتے تھے۔ ممکن ہے اور زبانیں بھی جانتے ہوں۔

" میں نے آج تک کوئی ایسا مقرر نہیں دیکھا جس کی زبان میں مولانا کی زبان سے زیادہ مٹھاس ہو اور جس کو مولانا سے زیادہ قدرت زبان پر حاصل ہو۔ مجھے کئی بار ان کی تقریر سننے کا شرف حاصل ہوا ہے اور میں نے ہر بار یہی محسوس کیا کہ وہ کسی بھی موضوع پر بول رہے ہوں، زبان ان کی تابع ہوتی ہے۔"

" ایک ہی شخصیت میں ایک عظیم سکالر، مذہبیات کے ایک عظیم عالم، ایک عظیم مقرر، اور صحیح معنوں میں ایک عظیم انسان کو ڈھونڈ نکالنا بڑا دشوار ہوتا ہے!"

(سری نگر میں مولانا آزاد پر مذاکرہ میں خطبۂ افتتاحیہ)

" مذہب کے دوکان داروں نے جہل و تقلید اور تعصب و ہوا پرستی کا نام مذہب رکھا ہے۔ اور روشن خیالی و تحقیقِ جدید کے عقل فروشوں نے الحاد و بے قیدی کو حکمت و اجتہاد کے لباسِ فریب سے سنوارا ہے — نہ مدرسہ میں علم ہے — نہ محرابِ مسجد میں اخلاص — اور نہ میکدہ میں رندانِ بے ریا۔

اربابِ صدق و صفا اِن سب سے الگ ہیں، اور سب سے پناہ مانگتے ہیں، ان کی راہ دوسری ہے"

قائداعظم اور مولانا ابوالکلام

آغا شورش کاشمیری

لارڈ ویول احوال و کوائف کا پورا نقشہ لے کر ۲۹ مارچ ۱۹۴۵ء کو دس روز کے لئے انگلستان چلے گئے۔ وہاں دس ہفتے قیام کیا۔ کابینہ سے مذاکرات کیے اور ۵ جون ۱۹۴۵ء کو دہلی واپس آ گئے۔ یہاں ایگزیکٹو کونسل کو برطانوی کابینہ کے فیصلے و نظریے سے مطلع کیا۔ ۱۵ جون کو ایک نشری تقریر میں اعلان کیا کہ وہ ملک کی سیاسی تنظیموں کے نمائندوں کو نمائندہ حکومت قائم کرنے کے لئے شملہ بلا رہے ہیں۔

گاندھی جی نے شملہ کانفرنس میں شامل ہونے سے اس عذر پر انکار کر دیا کہ وہ کانگریس کی طرف سے نمائندگی کے مجاز نہیں۔ کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد ہی گفتگو کر سکتے ہیں۔

لارڈ ویول نے انہیں دعوت نامہ بھیجا۔ مولانا نے قبول کر لیا۔ کل ۲۱ افراد مدعو کئے گئے جن میں مختلف پارٹیوں کے رہنما اور صوبائی وزارتوں (مستعفی وغیرہ مستعفی) کے وزراء اعظم بھی تھے۔

۲۴ جون کو وائسرائے نے بعض لیڈروں سے انفرادی ملاقاتیں کیں۔

۲۵ جون کو کانفرنس شروع ہوئی۔

ویول کی تجویز تھی کہ ۱۴ ارکان پر مشتمل ایک عبوری ایگزیکٹو کونسل بنائی جائے۔ جن کے پاس فوج کے سوا مالیات اور خارجہ کے محکمے بھی ہوں۔ پانچ ہندو،

پانچ مسلمان، ایک اچھوت، ایک سکھ، ایک اینگلو انڈین اور ایک عیسائی۔ یہ سب مل کر ملک کے آئندہ آئین کا نقشہ بنائیں۔ انہی کے اہتمام میں صوبائی اور مرکزی انتخابات ہوں۔

کانفرنس پہلے ہی ناکام ہونے لگی تو قائداعظم کی تحریک پر ۱۴ جون تک التوا ہو گیا۔ آخر لارڈ ویول نے جانبین کے نمائندوں کے نام طلب کیے۔

قائداعظم کو اصرار تھا کہ مسلمانوں کی نامزدگی کا حق صرف انہی کو ہے دُوسرا کوئی فرد، جماعت یا گروہ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعوے دار نہیں ہو سکتا!

مولانا ابوالکلام کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس اگر محض ہندو نامزد کرتی ہے تو اپنی تاریخ اور اس کے مؤقف سے گر جاتی ہے۔ اس قضیہ کے لئے مولانا نے یہ تو مان لیا کہ وہ کسی کانگریسی مسلمان کو نامزد نہیں کرتے، لیکن اپنے کوٹے میں سے ایک نشست لیگ سے باہر کسی بھی مسلمان کو دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام لیا۔ ایک دو اور نام بھی لئے گئے لیکن قائداعظم بضد رہے کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف لیگ ہی کو پہنچتا ہے۔

نتیجتہً کانفرنس ناکام ہو گئی۔

- -

مولانا ابوالکلام آزاد نے قائداعظم کو خط لکھا کہ انہیں اپنے مطالبات و شکایات سے مطلع کریں۔

قائداعظم نے جواب دیا کہ ان کی حیثیت کانگریس کے "شو بوائے" کی ہے۔ لہٰذا ان سے کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی۔ قائدِاعظم نے اپنا جواب پریس کو دے دیا۔ لیگ کے اخبار اور لیگ کے خطبا اس پھبتی کو لے اُڑے۔ مولانا آزاد کے عقیدت مندوں نے بھی جواب آں غزل کا لہجہ اختیار کیا۔ لیکن ظاہر ہے گالی

بہرحال گالی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے قائدِ اعظم کے اس طعن پر استفسار کیا گیا تو فرمایا:۔

"ہر شخص اپنے لب ولہجہ کا مختار ہوتا ہے مسٹر جناح نے اپنی عزت میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے"

شملہ کانفرنس میں مولانا نے قائدِ اعظم سے مصافحہ کرنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔

ایک اور روایت ہے کہ کانفرنس میں مولانا تقریر کر رہے تھے تو قائدِ اعظم اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذ پر "شو بوائے" کے حروف بنا رہے تھے۔

مولانا ان چیزوں سے بھڑکتے نہیں تھے۔ ان کا مزاج ہی دوسرا تھا۔

البتہ ڈاکٹر خان صاحب قائدِ اعظم سے اُلجھ گئے!

(دُودِ چراغِ محفل)

اُن بربادیوں میں جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہوتی رہی ہیں، بدقسمتی سے ہر فرقہ پرست جماعت کے لوگ اضافہ کرتے رہے، اور کوئی جماعت ایسی نہیں جس کے دامن پر خون کا دھبہ نہ لگا ہو۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جس دروازہ سے یہ فرقہ پرستی آئی ہے، اُس دروازہ کو بند کر دیں؟

(لکھنؤ میں، مسلمانانِ ہند کے ایک اجتماع سے خطاب ۱۹۴۸ء)

نفسِ مطمئنہ کا پیکر!

• علامہ نیاز فتحپوری •

مولانا آزاد کے جتنے خطوط اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں انہیں ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔ ایک وہ جن کا تعلق محض ادبی مسائل سے ہے۔ دوسرے وہ جو علمی و مذہبی مباحث سے تعلق رکھتے ہیں اور تیسرے وہ جن کو مختار قسم کی خود کلامی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ غلام رسول مہر کو جو خطوط انھوں نے لکھے ان کا تعلق زیادہ تر غالب وغالبیات سے ہے۔ سید سلیمان ندوی اور مولانا شبلی سے اُن کی مراسلت زیادہ تر تاریخی و علمی یا تصنیفی و تالیفی حیثیت رکھتی ہے جن کو شذرات کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ لیکن وہ خطوط جو "غبارِ خاطر" کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں، ایک حد تک ضرور ایسے ہیں جن کو پڑھ کر یہ محسوس ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مخاطب سے شب خوابی کے لباس میں باتیں کر رہے ہیں یا پھر علی الصباح اس وقت جب کہ:

جلند کلیدِ میکدہ در دست برہمن

تاہم مولانا کو یقین تھا کہ یہ خطوط مکتوب الیہ تک نہیں پہونچ سکتے، اس لئے میرے نزدیک ان کی حیثیت 'خود کلامی' کی سی رہ جاتی ہے یا ESSAYS کی سی!

اِن خطوط کے مطالعہ سے ہمیں بعض اِن باتوں کا بھی علم ہو جاتا ہے جنہیں شاید ہم کبھی نہ جان سکتے اگر مولانا خود نہ ظاہر کر دیتے، مثلاً خاندانی ماحول، ابتدائی تعلیم و تربیت، فطری میلانات، ذہنی کشمکش، آزادیٔ فکر و احساس، ذاتی

مشاغل وغیرہ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس درجہ غیر معمولی طور پر (GENIUS) پیدا ہوئے تھے اور فہم و عقل کی دُنیا میں وہ گھٹنوں چل کر نہیں پہونچے۔
ان کے بعض خطوط سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی علمی و ادبی زندگی کے انوکھے پن کا راز کیا تھا۔ اس کو وہ اپنی زبان میں اہلِ قلم کی انانیت (EGOISM) کہتے ہیں یا بالفاظِ دیگر ایک فطری جوش، ایک طبعی اُبال جسے دبایا نہیں جا سکتا اور یہی وہ ناقابلِ ضبط ولولہ تھا جس نے ان کی علمی و عملی زندگی میں ہر جگہ ان کو ایک خاص مقام عطا کیا، کیوں کہ ایسے افراد جیسا کہ انھوں نے خود ظاہر کیا ہے، عام ترازو میں نہیں تولے جا سکتے اور ان کے فکر و نظر کی دُنیا سب سے علحدہ ہوتی ہے۔
مولانا آزاد کا زمین پر رہ کر تاروں کو چھو لینا اور انسانوں میں رہتے ہوئے ایک ملکوتی حصار اپنے چاروں طرف قائم کر لینا اسی فکری انانیت کا نتیجہ تھا جس کا ثبوت ان کی تحریروں اور ان کے خطوط سے ہر جگہ مل سکتا ہے۔
"غبارِ خاطر" کا ایک خط ہے جس میں انھوں نے اپنے موروثی ماحول، اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت اور اپنے میلانات کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس فطری انانیت کی وجہ سے اپنے موروثی عقاید پر قانع نہ رہ سکے، پُرانی راہوں کو چھوڑ کر نئی راہیں انھوں نے پیدا کیں، حقیقت کی جستجو میں نہ معلوم کن کن خارزاروں سے گزرے، تقلید و روایت کی دُنیا سے نکلنے کے لئے کس جد و جہد سے کام لیا یہاں تک کہ وہ تمام ان برزخی منازل سے گزر کر آخر کار تسکین ضمیر اور نفسِ مطمئنہ کی اُس منزل تک پہونچ ہی گئے جس کے لئے ان کی رُوح اوائلِ عمر ہی سے بیتاب و مضطرب تھی۔
پھر یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اسی زمانہ میں جب کہ وہ جستجوئے حقیقت کی پیچیدہ راہوں سے گزر رہے تھے ملک کے سیاسی حالات نے بھی ان کا دامن اپنی

طرف کھینچا اور آخرکار کامل غور و فکر کے بعد اپنے ذہن و عمل کے متوازی خطوط میں لچک پیدا کرکے دونوں کو ایک نقطہ پر مل جانے دیا اور پھر وہیں عزمِ راسخ کا ایک آہنی مجسمہ بن کر ٹھہر گئے۔

ان خطوط سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے غیور انسان تھے اور دُنیا کے ہر معاملہ کو وہ کس فلسفیانہ نگاہ اور حکیمانہ استغناء سے دیکھتے تھے۔ جن خطوط میں انھوں نے اپنی داستانِ گرفتاری اور حالات قید و بند لکھے ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فلسفیانہ صبر و ضبط کا کیا عالم تھا۔ ان کو کلکتہ سے کتابیں منگانے کی اجازت دی جاتی ہے جس کی ان کو انتہائی آرزو تھی لیکن وہ اسے گوارا نہیں کرتے، مولانا کی رفیقۂ حیات بسترِ علالت پر ان کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہی ہیں اور مولانا کو اسکی اجازت بھی مل سکتی ہے کہ وہ جاکر ان کو دیکھ آئیں لیکن حکومت سے وہ اس کی درخواست کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو جاتا ہے اور مولانا نہایت صبر و شکر کے ساتھ یہ خبر سنتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں۔ کیسی سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے، لیکن مولانا کی زندگی میں اور بہت سی باتیں ہمیں ایسی ہی نظر آتی ہیں جن کو سمجھے بغیر ہی سمجھنا پڑتا ہے۔

مولانا کے خطوط دوسرے اکابر کے خطوط سے بالکل مختلف ہیں۔ ذاتی خطوط کو صرف اس لئے دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے کہ تھم کو ان کے لکھنے والوں کی بے تکلف زندگی کے حالات بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہو جاتے ہیں، لیکن مولانا کے جو خطوط اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں، وہ زیادہ تر پندنامۂ عطار کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے ان کی خلوت پر روشنی نہیں پڑتی، یہاں تک کہ حکایت زاغ و بلبل اور چڑے چڑیا کی کہانی قسم کی ہلکی چیزوں میں بھی وہ اپنی فلسفیانہ سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور جب اپنے ذوق چاء نوشی کا ذکر کرتے ہیں تو گفتگو اس کے آئین و آداب تک

پہونچ جاتی ہے۔ اسی طرح جب سلسلۂ بیان میں کسی خاص شخص یا مقام کا ذکر آ جاتا ہے تو وہ تاریخ کے صفحے الٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ الغرض مولاناکے ان خطوط سے ان کی خلوت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی اور جنھوں نے مولانا کا مطالعہ زیادہ قریب سے کیا ہے ان کو بھی خلوتیان راز بننے کا شرف کبھی حاصل نہیں ہوا۔ مولانا کی فطرت اس صدف کی سی فطرت تھی جو اندر ہی اندر قطرۂ نیساں کو موتی بنایا کرتی ہے اور کسی کو اس کا علم نہیں ہوتا۔

(ماہنامہ "نگار" سے ماخوذ)

مولانا
ابوالکلام
آزاد
فرمودات
و
نگارشات
کی
روشنی میں!

اگلے صفحات پر آپ مولانا **ابوالکلام آزاد** رحمتہ اللہ علیہ کی نہایت مختصر تعارفی سوانح ان کے سیاسی افکار کی جھلک کے ساتھ مطالعہ فرمائیں گے۔

یہ "سوانح اور افکار" مولانا آزاد کے فرمودات و نگارشات کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔

★ ایک ایسی شخصیت جو برصغیر ایشیا اور عالم اسلام کے سیاسی وقائع پر نصف صدی تک اثر انداز ہوتی رہی، اور جو اپنے بعد قرنہا قرن تک آنے والوں کے واسطے فکر و عمل کی راہیں کھول گئی۔

اس شخصیت کی سوانح اور افکار کی ترتیب کے لئے بیسیوں جلدوں کی ضرورت ہے۔ یقیناً یہ مختصر مضمون کافی نہیں ہو سکتا۔

تاہم اس مضمون سے وہ خطوط سامنے آجائیں گے جو اس عہد آفرین اور عصر ساز شخصیت کی سوانح اور افکار کی اہمیت و ضرورت کو واضح کرنے والے ہیں:

مولانا لکھتے ہیں :۔

" میں ۱۸۸۸ء میں مکۂ معظمہ میں پیدا ہوا تھا ۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد میرے والد مولانا خیرالدین ، اپنے نانا مولانا منوّرالدین کے ساتھ ۲۵ سال کی عمر میں ہندوستان سے مکۂ معظمہ ہجرت کر گئے تھے ۔ نانا تو بمبئی جا کر وفات پا گئے ۔ والد مکۂ معظمہ پہنچ گئے ۔

وہاں شیخ محمد طاہر وتری کی صاحبزادی کے ساتھ والد کا نکاح ہو گیا ۔

میری پیدائش کے دو سال بعد والد پورے خاندان سمیت کلکتہ آ گئے ۔ والد ایک بہت بڑے پیر تھے جن کے مریدین ہندوستان اور ہندوستان سے باہر عرب دُنیا و ترکی تک پھیلے ہوئے تھے ۔

پیری مریدی کے اس ماحول میں میری پرورش ہوئی ۔ ہمارا گھر سخت ترین مذہبی رسوم و رواج کا حامل تھا ۔

جدید طرزِ زندگی اور جدید تعلیم کا نہ تو ہمارے ماحول میں کوئی گزر تھا اور نہ کوئی اسے اچھی نظر سے دیکھتا تھا ۔

والد نے میری تعلیم کا گھر پر ہی انتظام کیا اور میں اس زمانہ کی مروّجہ مذہبی تعلیم کی مکمل درسیات سے بالکل چھوٹی سی عمر میں فارغ ہو گیا ۔

اس دوران میں ادھر اُدھر سے میں جدید رسائل و کتابیں حاصل کر کے

پڑھتا رہا اور اپنے طور پر انگریزی بھی سیکھ لی جس سے انگریزی اخبارات پڑھنا آسان ہو گیا۔

میں اپنے ماحول کی مذہبی فضاء سے مطمئن نہیں ہو سکا اور رائج رسموں اور عقیدوں کو قبول کرنا میرے لئے ممکن نہیں رہا۔

سب سے پہلی بات جس نے مجھے پریشان کیا وہ مسلمانوں کا باہمی اختلاف تھا۔

میں نے اسلام کا اور دوسرے مذاہب کا تفصیل سے مطالعہ کرنا شروع کیا اور اضطراب، تذبذب اور انکار کے متعدد مراحل سے گزر کر، مذاہب کی اصل حقیقت اور اسلام کی اصل روح کو سمجھنے میں کامیاب ہوا۔

میں جس نقطۂ نگاہ پر پہنچا اس کی تفاصیل، سورۂ فاتحہ کی میری تفسیر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

بہرحال میں اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ اسلام دنیا میں انسانی حریت اور مساوات کا سب سے بڑا علمبردار ہے!

مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ نہ صرف اپنے اندر آزادی و مساوات کو قائم کریں بلکہ اپنے گرد و پیش کے دوسرے لوگوں کے لئے بھی اس کے حصول میں پیش پیش رہیں۔

یہ بات میں نے ابتداء سے ہی اپنی تقریروں اور تحریروں میں واضح کرنا شروع کر دی تھی۔

ہندوستان میں اور ایشیاء میں مسلمان تعداد اور اپنے ماضی کے اثرات کے اعتبار سے بہت بڑی طاقت رکھتے تھے!

اور برطانوی استبداد کی گرفت سے اس پورے علاقہ کو آزادی دلانا ان کا نہ صرف ملّی فریضہ تھا بلکہ ایک نہایت مسلّم اور بنیادی مذہبی

فرض تھا۔

ہندوستان کی آزادی پر چوں کہ تمام ایشیاء، عرب دُنیا اور عالمِ اسلام کی آزادی کا انحصار تھا، اس لیے میں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادیٔ انقلاب کی جدوجہد میں سب سے آگے آنا چاہیئے۔

اس زمانہ میں لارڈ کرزن، ہندوستان کے گورنر جنرل اور وائسرائے تھے اور انھوں نے ۱۹۰۵ء میں فیصلہ کیا تھا کہ بنگال کو تقسیم کر کے سیاسی اعتبار سے اسے کمزور کر دیا جائے۔ اس لئے کہ بنگال سیاسی اعتبار سے ہندوستان کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ صوبہ تھا۔

لارڈ کرزن کا خیال تھا کہ تقسیم کے بعد بنگال، ہندو، مسلم دو منطقوں میں بٹ جائے گا مسلمان پس ماندہ ہیں اس لئے انہیں حکومتِ برطانیہ چند ایک رعایتوں کے ساتھ اپنا آلۂ کار بنالے گی اور ہندو مسلمانوں کے درمیان مستقل خلیج پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہندوؤں کا سیاسی رُخ حکومتِ برطانیہ کے بجائے مسلمانوں کی طرف منتقل ہو جائے گا!

تقسیم کردہ بنگال کے بڑے حصے مشرقی بنگال کے مقرر کردہ لیفٹیننٹ گورنر بیم فیلڈ فلر نے یہاں تک کہہ دیا کہ :۔

• حکومتِ برطانیہ مسلمان گروہ کو اس نظر سے دیکھتی ہے جیسے ایک شوہر اپنے حرم کی بیوی کو دیکھتا ہے! •

برطانوی حکومت کی اس خطرناک چال کے جو خطرناک عواقب مسلمانوں کے حق میں نکل سکتے تھے، انہیں میں نے شدت سے محسوس کیا اور میں نے طے کر لیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریز حکومت کی اس خطرناک چال سے بچانے کی باقاعدہ کوشش کروں اور سیاسی جدوجہد میں انہیں اپنے ہم وطن ہندوؤں

کے برابر لا کھڑا کر دوں تاکہ وہ آزاد ہندوستان میں اپنے ہم وطنوں کے مساوی حقوق حاصل کر سکیں اور حکومتِ برطانیہ کی سیاسی فریب کاری کا شکار بن کر، ہر سیاسی حق سے محروم نہ رہ جائیں۔

لارڈ کرزن کے تقسیم بنگال کے آگے ، بنگال نے سر جھکانے سے انکار کر دیا اور وہاں اس قدر زبردست مخالفانہ شورش برپا ہوئی کہ ماضی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

آربندو گھوش نے کلکتہ سے "کرم یوگن" کے نام سے ایک اخبار جاری کر کے غیر ملکی حکومت کے خلاف بغاوت کی تخم ریزی شروع کر دی۔

یہ انقلابی تحریک و تنظیم جس نے پورے بنگال اور بنگال سے باہر دور دراز تک اپنے اثرات پھیلا دیئے تھے، مسلمانوں پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

نئے قائم کردہ صوبہ مشرقی بنگال کے گورنر کے اس بیان نے کہ حکومتِ برطانیہ مسلمانوں کو اپنے حرم کی بیوی کی حیثیت دیتی ہے اور بنگال کی انقلابی تحریک کے خلاف کاروائی کرنے کے لئے، پولیس کے محکمہ کے لئے، یو.پی وغیرہ سے مسلمانوں کو بلا کر رکھنے نے، انقلابیوں کو مسلمانوں کی طرف سے بدظن کر دیا تھا۔

چنانچہ تمام انقلابی جماعتیں، مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم ہو گئیں۔

گویا انگریز حکومت کا یہ منشا پورا ہونے لگا کہ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہو جائیں اور برطانوی حکومت انقلابیوں کی زد سے محفوظ رہے۔

انگریزوں کی اس خطرناک چال کو ناکام بنانے کے لئے ضروری تھا کہ انقلابیوں کے ساتھ میرا ربط و ضبط پیدا ہو اور میں انہیں یہ باور کرا سکوں کہ مسلمان بہ حیثیت ایک جماعت کے ہرگز ان کے دشمن نہیں ہیں اور چند مسلمان سرکاری ملازمین کا فعل، پوری مسلمان امت کے عمل کی ترجمانی نہیں کرتا!

اس مقصد کے لئے میں نے ایک انقلابی رہنما شیام سندر چکرورتی سے کسی طرح رابطہ قائم کیا۔ انقلابیوں میں ان کا بڑا احترام تھا۔ ان کے ذریعہ دُوسرے انقلابی کارکنوں سے ملا۔ آربندو گھوش سے بھی کئی بار ملاقات کی۔

حتیٰ کہ میں نے انقلابی تحریک کو اپنی خدمات باقاعدہ پیش کر دیں۔

اوّل اوّل وہ لوگ مجھ پر بھی بھروسہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے اور اپنی مخصوص محفلوں سے مجھے دُور رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔

لیکن میں نے انہیں باور کرایا کہ مسلمانوں کے سلسلہ میں ان کا یہ روّیہ بجائے خودِ انقلابی تحریک کے لئے نقصان دہ ہے۔

مِصر، ایران اور ترکی میں مسلمانوں کی انقلابی تحریکیں کام کر رہی ہیں اور وہاں آزادی وجمہوریت کی تحریکیں مسلمانوں کے ہاتھوں میں پروان چڑھ رہی ہیں تو ہندوستان کے مسلمانوں میں کیوں یہ رجحان پیدا نہیں ہو سکتا۔

مسلمانوں کو مخالف رکھنے کا نتیجہ، انقلابی تحریک کی ناکامی کی صُورت میں نکلے گا اور انگریزی حکومت کو اس سے فائدہ پہنچے گا!

اس دوران، میں بھی مسلمانوں میں انقلابی رجحانات پیدا کرنے کے لئے کام کرتا رہا۔ اور نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت میں نے تیار کر لی۔

آخرکار بنگال کے انقلابیوں پر میری بات کا اثر ہُوا۔ انھوں نے اپنی غلطی محسوس کی اور مسلمانوں کے خلاف ان کے اندیشے و وسوسے دُور ہو گئے۔

انقلابی تحریک میں شامل ہونے کے بعد میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ انقلابیوں کی کاروائیاں نہایت محدود ہیں۔ میں نے انھیں متوجہ کیا کہ ان کا دائرہ وسیع کرنا چاہیئے اور نہ صرف ہندوستان کے تمام صوبوں میں اپنی شاخیں کھول دینا چاہیئے بلکہ بیرونِ ملک کی انقلابی تحریکوں سے بھی ربط و ضبط بڑھا کر

برطانوی سامراج کے خلاف وسیع تر محاذ بنانا چاہیئے!

اس زمانہ میں مجھے عراق، شام، مصر اور ترکی وغیرہ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ فرانسیسی زبان میں نے اسی سفر میں سیکھی۔

۱۹۰۸ء میں عراق پہنچا۔ وہاں کے انقلابیوں سے ملا۔ مصر میں مصطفیٰ پاشا کے پیروکاروں سے ملا۔ ترکی میں ینگ ترکش تحریک کے لیڈروں سے ملاقات کی۔

اس سیاحت کے دوران ہر جگہ کے انقلابیوں نے مجھے اس طرف متوجہ کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادی کی تحریک سے بے تعلق نہیں رہنا چاہیئے۔ نہ برطانوی حکومت کے مقاصد کا معاون بننا چاہیئے۔ اس سے پورے ایشیا کی اور مسلمان ملکوں کی آزادی کی جدوجہد میں خلل پڑے گا اور برطانیہ و یورپین طاقتوں کے استعماری مقاصد پورے ہوتے رہیں گے۔

میں ان خطوط پر پہلے ہی کام شروع کر چکا تھا۔ میں نے اس سفر میں ہندوستان کی انقلابی تحریکوں کے درمیان رابطہ کی کڑیاں قائم کیں۔ اور وہاں سے واپسی پر، ہندوستان کے مسلمانوں میں حصول آزادی کا ولولہ پیدا کرنے کے لئے ضروری سمجھا کہ ایک اخبار جاری کیا جائے۔

ہفت روزہ "الھلال" کا اجراء اسی مقصد کے لئے ہوا۔ جون ۱۹۱۲ء میں "الہلال" کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔

میری ان کوششوں سے ایک طرف بنگال کی انقلابی تحریک، ہندو انقلاب کی تحریک کے بجائے ہندوستانی انقلاب کی تحریک میں تبدیل ہو گئی۔ اس میں مسلمانوں کی شمولیت کا دروازہ بھی کھل گیا۔ مسلمان نوجوانوں میں سیاسی شعور بیدار ہو گیا۔ ہندوستان کی انقلابی تحریکوں کا ربط و ضبط ایشیاء اور یورپ کی

انقلابی تحریکوں کے ساتھ قائم ہو گیا۔ انگریزوں کو بنگال کی تقسیم منسوخ کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور ہندوستان میں حصولِ آزادی کی جدوجہد کا ہندو مسلمانوں پر مشتمل متحدہ محاذ قائم ہونے کی راہ ہموار ہو گئی۔

"الہلال" کی آواز پورے ہندوستان میں گونج اٹھی۔ مذہبی اور غیر مذہبی سب ہی حلقوں میں اس آواز کو ذوق و شوق اور جوش و خروش سے سنا گیا۔ برطانوی حکومت کے لئے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے "الہلال" کا گلا گھونٹنے کے لئے پہلے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی۔ جب اس طرح بھی اس کی آواز بند نہیں ہوئی تو دس ہزار کی ضمانت مانگی۔ اس سے بھی کام نہیں چلا تو ۱۹۱۵ء میں الہلال پریس ضبط کر لیا۔ میں نے "البلاغ" کے نام سے نیا پریس قائم کر کے اسی نام کا اخبار جاری کر دیا تو حکومت نے ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشن کے تحت مجھے کلکتہ بدر ہو جانے کا حکم دے دیا۔ پنجاب، یوپی، دہلی اور بمبئی میں میرا داخلہ پہلے ہی بند کر دیا گیا تھا۔

میں بہار کے ایک شہر رانچی چلا آیا تو یہاں حکومت نے مجھے نظر بند کر دیا اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء تک میں یہاں حراست میں رہا۔

یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو میری رہائی عمل میں آئی۔

اس دوران گاندھی جی نے مجھ سے رانچی میں ملاقات کرنی چاہی، لیکن حکومت نے اجازت نہیں دی۔

۱۹۲۰ء میں ہندوستان کے مسلمانوں میں مسئلہ خلافت نے بہت بے چینی پیدا کر دی تھی۔ ہندو رہنما بھی اس مسئلہ میں ان کے ساتھ تھے۔ تلک، گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی رہنماؤں نے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی بھرپور تائید و حمایت کی۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک متحدہ محاذ بنا اور حکومت کے خلاف تحریک عدم تعاون جاری کرنے کا فیصلہ ہوا۔

ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علیؒ، مولانا شوکت علی حکیم اجمل خان اور مولانا عبدالباری فرنگی محل، شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور ان کے شاگرد مسلمانوں کی طرف سے اور ہندوؤں میں گاندھی جی، موتی لال نہرو، لاجپت رائے، سی آر داس وغیرہ سب ہی بتدریج اس رائے سے متفق ہوتے گئے۔

دسمبر ۱۹۲۱ء میں ناگپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا اور عدم تعاون کی تجویز پر ریزولیشن پاس ہو گیا۔

مسٹر جناح نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور وہ کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔

تحریک جاری ہو گئی اور ملک میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہندو مسلم اتحاد کی قوت نے تحریک کو اتنا زوردار بنایا کہ انگریزی حکومت کے پیر اکھڑنے لگے۔

اب انگریز حکومت نے اس سے نمٹنے کے لئے ہندو مسلم فساد شروع کرانے کا حربہ آگے بڑھایا۔

متعدد جگہ ہندو مسلم فسادات ہوئے اور ایک فریق نے دوسرے فریق پر الزامات عائد کرنے شروع کر دیئے۔

ہندو مسلم اتحاد کی دیوار میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ تاہم برطانوی حکومت کے خلاف تحریک جاری رہی۔

دسمبر ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے مکمل آزادی کا اعلان کر دیا۔ بالآخر برطانوی حکومت تصفیہ کی طرف مائل ہوئی۔

گاندھی ارون پیکٹ ہوا اور لندن میں گول میز کانفرنسوں کا اہتمام ہونے لگا۔

مسلم لیگ از سرِ نو زندہ کی گئی۔ ہندو مسلم سوال پھر چھیڑ دیا گیا اور انگریزی حکومت کو یہ موقع مِل گیا کہ اُس نے اپنی صوابدید کے مطابق انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء تیار کر کے ہندوستان میں نافذ کر دیا۔

اس ایکٹ کے تحت پہلے انتخابات ہوئے۔ کانگریس کو پانچ بڑے صوبوں میں کامل اکثریت حاصل ہوئی۔ چار صوبوں میں وہ سب سے بڑی واحد پارٹی کی صورت میں کامیاب ہو کر نکلی۔ صرف پنجاب اور سندھ میں وہ مقابلتاً ایسی کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔

پنجاب میں یونینیسٹ پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی اور سندھ میں اللہ بخش گروپ کو۔

اس انتخاب کے نتیجہ میں، کچھ عرصہ کی بحث و تمحیص کے بعد ہر صوبہ میں وہاں کی اکثریتی پارٹی نے، صوبائی حکومت کی تشکیل کی۔

کانگریس نے بھی جن صوبوں میں اکثریت حاصل کی تھی، وہاں حکومتیں بنائیں۔

لیکن ۱۹۳۹ء میں جرمنی کے اعلانِ جنگ کے بعد، جب برطانیہ نے بھی فرانس کے ساتھ مل کر جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور ہندوستان کو بھی اس اعلان میں شریک کر لیا۔ (یہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کی بات ہے) تو کانگریسی وزارتوں نے احتجاجاً استعفٰی دے دیا۔ کانگریس کا مؤقف یہ تھا کہ: ہندوستان کی مکمل آزادی کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جنگ میں شمولیت کے لئے آزادانہ فیصلے کا حق دیا جائے!

وائسرائے نے جس طرح جنگ میں ہندوستان کی شمولیت کا اعلان کیا ہے وہ ایک آزاد اور خود مختار قوم کی نمائندگی نہیں کرتا!"

۱۹۴۰ء میں کانگریس کے صدارتی انتخاب کے لئے میرا نام پیش کیا گیا۔ اس سے

قبل میں دو بار یہ ذمہ داری اُٹھا چکا تھا۔ ہر چند کہ میں نے انکار کیا، لیکن گاندھی جی سمیت بیشتر کانگریسی رہنما برابر اصرار کرتے رہے۔

صدارتی انتخاب میں مسٹر ایم این رائے میرے حریف تھے۔ انتخاب کا نتیجہ بھاری اکثریت کے ساتھ میرے حق میں نکلا۔

اس وقت راجندر پرشاد کانگریس کے صدر تھے۔ رام گڑھ میں سالانہ اجلاس ہُوا۔ میں نے صدارتی خطاب میں کانگریس کی واضح پالیسیوں کا اعلان کیا اور راجندر پرشاد سے صدارت کا چارج لے لیا۔

میں نے اپنے صدارتی خطبہ میں واضح کر دیا کہ ہم مکمل آزادی سے کم کسی بات پر راضی نہیں ہوں گے اور بالغ رائے دہی پر مبنی منتخب شدہ دستور ساز اسمبلی ملک کے لئے ایک وفاقی دستور مرتب کرے گی۔ جس میں ملک کی تمام اکثریتوں اور اقلیتوں کو مکمل آزادی اور ترقی کے مواقع حاصل ہوں گے۔ لسانی بنیادوں پر صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے گی اور سماجی ناانصافیوں سے پاک کامل عدل و انصاف و مساوات پر مبنی نظام قائم کیا جائے گا۔

صدارت کا چارج سنبھالنے کے بعد، میں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کی از سرِ نو تشکیل کی۔ ورکنگ کمیٹی ۱۵ ممبروں پر مشتمل تھی۔ میں نے مندرجہ ذیل افراد کو نامزد کیا:۔

۱۔ سروجنی نائیڈو ۲۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل ۳۔ سیٹھ جمنا لال بجاج ۴۔ جے، بی کرپلانی ۵۔ بھولا بھائی ڈیسائی ۶۔ شنکر راؤ دیو ۷۔ ڈاکٹر پرفلا چندر گھوش ۸۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد ۹۔ جواہر لال نہرو ۱۰۔ سی راج گوپال اچاریہ ۱۱۔ مسٹر آصف علی ۱۲۔ ڈاکٹر سید محمود ۱۳۔ خان عبدالغفار خان ۱۴۔ میں خود۔

میری ایک تجویز اور جناح صاحب کا جواب

وسط جون ۱۹۴۰ء میں کانگریس کی صدارت سنبھالنے کے بعد میں نے ہندو مسلم اختلاف کے تصفیہ کی غرض سے بحیثیت صدر کانگریس مسٹر محمد علی جناح صدر مسلم لیگ کو یہ تجویز بھیجی کہ ہندوستان کے تمام صوبوں اور مرکز میں، کسی ایک پارٹی کی وزارت کے بجائے، کانگریس اور مسلم لیگ پر مشتمل مخلوط وزارتیں بنائی جائیں۔

مسٹر جناح نے، میری تجویز یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ تم کو کانگریس نے شو بوائے کی طرح کانگریس کا صدر بنایا ہے، اس لئے میں تم سے کسی طرح کی گفتگو نہیں کرنا چاہتا ہوں۔

اور برابر کی سطح پر ہندو مسلم تصفیہ کا یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

مارچ ۱۹۴۲ء میں، کرپس، برطانوی حکومت اور کانگریس کے درمیان مفاہمت کرانے اور ہندوستان کے رہنماؤں سے بات چیت طے کرنے کی ایک اسکیم لے کر آئے۔ یہ گفتگو مختلف مراحل سے گزر کر ناکام ہو گئی۔

کوشش مفاہمت کی اس ناکامی کے بعد، کانگریس کے سامنے، حصولِ آزادی کی جد و جہد کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا۔

"ہندوستان چھوڑ دو" کے نعرہ کے ساتھ کانگریس نے حصولِ آزادی کے پروگرام کا اعلان کر دیا۔ لیکن برطانوی حکومت صبر نہ کر سکی اور پورے ملک میں گرفتاریاں شروع کر دیں۔ اس کا نتیجہ حکومت اور عوام کے درمیان کھلے تصادم کی صورت میں نمودار ہوا۔

۹ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں، میں اور میرے تمام کانگریسی رفقاء گرفتار

کر لیے گئے تھے۔ گاندھی جی کو پونا میں اور مجھے میرے ساتھیوں سمیت احمد نگر میں نظر بند کر دیا گیا۔

ہماری حراست کے مقام کو عوام سے پوشیدہ رکھا گیا اور پورے ملک میں سخت ترین داروگیر کی فضا مسلط کر دی گئی۔

تاہم ہندوستان کی آزادی کے سلسلہ میں برطانوی حکومت پر بین الاقوامی دباؤ بڑھتا رہا۔ برطانیہ کے اتحادیوں نے برطانیہ کے اس طرزِ عمل کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا اور جیسے جیسے یورپ میں جنگ پھیلتی گئی، برطانیہ کی اتحادی طاقتیں ہندوستان کے بارے میں برطانیہ کی پالیسی میں تبدیلی کا مطالبہ تیز تر کرتی گئیں۔

برطانوی حکومت کے اندازوں کے برعکس، ہندوستان میں بھی، آزادی کی جدوجہد زور پکڑتی چلی گئی اور یہ اندیشہ پیدا ہونے لگا کہ جلد ہی اس کا رُخ تخریب و تشدد کی طرف مڑ جائے گا!

اس دوران برطانوی ڈپلومیسی، ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسائل کو ہوا دے کر جدوجہدِ آزادی کی بڑھتی ہوئی رَو کو روکنے کی کوشش کرتی رہی۔

چنانچہ ہندو مسلم سیاسی نزاع ہماری طویل حراست کے دوران سنگین نوعیت اختیار کر گیا۔

باایں ہمہ برطانوی حکومت، حصولِ آزادی کی جدوجہد کو سرد کرنے میں ناکام رہی۔

اور بالآخر اسے کانگریس کے ساتھ مفاہمت کرنے کی ضرورت کا احساس شدید تر ہونے لگا۔

مئی ۱۹۴۵ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ویول صورتِ حال پر مشورہ

کے لئے انگلستان گئے۔

جون میں یہ اعلان ہوا کہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ حل کرنے کے لئے ازسرِنو کوشش کی جاتی گی۔ شملہ میں ایک کانفرنس بلائی جائے گی۔ کانگریس کے صدر اور ورکنگ کمیٹی کے ممبران کو رہا کر دیا جائیگا تاکہ وہ بھی کانفرنس میں شرکت کر سکیں۔ مسلم لیگ اور دوسری سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں کو بھی بلایا جائیگا۔

اس اعلان کے فوراً بعد ہم لوگ رہا کر دیئے گئے۔

رہائی کے ایک دِن بعد، شملہ کانفرنس میں شرکت کے لئے وائسرائے کا دعوت نامہ مجھے ملا۔ کانفرنس ۲۵ جون کو ہونا تھی۔

مقررہ تاریخ تک کانفرنس کے تمام مدعوئین شملہ پہنچ گئے۔

کانفرنس میں شرکت کرنے والے افراد، کانگریس کے صدر، مسلم لیگ کے صدر، شیڈول کاسٹ اور سکھوں کے نمائندے، مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر، مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر، صوبہ جاتی حکومتوں کے وزراء اعلیٰ (موجودہ اور سابقہ) تھے۔

کانفرنس میں وائسرائے نے، برطانوی حکومت کی تازہ ترین تجویز پیش کی۔ جس کا مقصد ہندوستانی نمائندوں پر مشتمل، ایک ایسی ایگزیکٹو کونسل قائم کرنا تھا جس کو حکومت کے تمام اختیارات حاصل ہوں گے اور وائسرائے اس کمیٹی کے سربراہ ہوں گے۔

اس تجویز پر میں نے کانگریس کا نقطۂ نظر پیش کیا اور پوچھا کہ اس کونسل سے وائسرائے کا کیا تعلق ہوگا؟ وہ محض رسمی سربراہ ہوں گے یا انہیں "ویٹو" کا اختیار حاصل ہوگا؟

کیا فوج کا شعبہ بھی ہندوستانی نمائندے کے سپرد کر دیا جائیگا؟

کیا برطانوی حکومت کو یہ منظور ہے کہ جنگ میں ہندوستان کی آئندہ شمولیت اس کے نمائندوں کی مرضی سے ہو؟

وائسرائے نے میرے ان سوالات کا جواب کانگریس کے نقطۂ نظر کی موافقت میں دیا۔

وائسرائے کی طرف سے ایگزیکٹو کونسل کے قیام کی برطانوی تجویز سب کے لئے قابلِ قبول تھی۔ لیکن کونسل میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا مسئلہ موجب نزاع بن گیا۔ برطانوی حکومت کی تجویز کے مطابق، ایگزیکٹو کونسل، ۱۴ ارکان پر مشتمل ہوتی۔ ۵ ارکان کانگریس نامزد کرتی، ۵ ارکان مسلم لیگ نامزد کرتی اور ۴ ارکان وائسرائے نامزد کرتے۔

مسلم لیگ مسلمانوں کی جماعت تھی، اسے حق تھا کہ وہ اپنے کوٹہ میں جن مسلمانوں کو چاہے نامزد کر دے۔

کانگریس قومی جماعت ہونے کی دعویدار تھی۔ چنانچہ اسے بھی حق تھا کہ وہ جن جن افراد کو چاہے نامزد کرے۔

کانگریس چاہتی تھی کہ وہ اپنی اس قومی حیثیت کے مطابق ہر فرقہ سے ایک ایک نمائندہ نامزد کرے۔

عیسائیوں، پارسیوں، سکھوں اور مسلمانوں کے نام پیش کرنے سے اگرچہ ہندوؤں کی نمائندگی کم ہو جاتی تھی اور ۱۴ ارکان کی ایگزیکٹو کونسل میں صرف ایک یا دو ہندو شامل ہو سکتے، تاہم کانگریس اپنی قومی حیثیت برقرار رکھنے کے لئے، ایسا کرنے پر آمادہ تھی۔ لیکن مسٹر جناح نے اصرار کرنا شروع کیا کہ کانگریس اپنے کوٹہ کے پانچ پانچ ارکان صرف ہندوؤں کو نامزد کرے۔ لیکن کانگریس کی طرف سے صدر

کانگریس کی حیثیت سے میرا نام شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک ایک نمائندہ عیسائی اور پارسی فرقہ سے لیا جانا طے ہوا اور باقی دو نام جواہر لال اور سردار پٹیل کے تجویز کئے گئے۔

لارڈ ویول نے چار ناموں کی فہرست خود تیار کی۔ اس میں انہوں نے دو نام اچھوت نمائندوں کے، ایک نام سکھ نمائندہ کا اور ایک نام خضر حیات خان کا تجویز کیا جو اس وقت صوبہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔

مسٹر جناح نے یہاں بھی اصرار کیا کہ وائسرائے چوتھا نام مسلمان کا تجویز نہ کریں۔

مسٹر جناح کے اس اعتراض و اصرار کی وجہ سے کانفرنس ناکام ہو گئی۔

میں دس سال گزر جانے کے بعد بھی یہ سمجھنے سے قاصر رہا ہوں کہ غیر تقسیم شدہ ہندوستان کی پہلی حکومت، جو ۱۴ ارکان پر مشتمل ہوتی اور جس میں ۷ مسلمان نمائندے ہوتے اور ۷ غیر مسلم نمائندے، جن میں ہندو صرف ۲ ہوتے، اسلام اور مسلمانوں کے کون سے اہم مفاد کے پیشِ نظر مسٹر جناح کے لئے قابلِ قبول نہیں تھی؟

کیا اس طرح مسلمانوں کو، ہندوستان کی پہلی حکومت میں ایک معقول حصہ نہیں مل رہا تھا؟

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد برطانوی حکومت نے ہندوستان میں عام انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔

انتخابات میں بنگال، پنجاب اور سندھ کے سوا باقی تمام صوبوں میں کانگریس نے اکثریت حاصل کر لی۔

بنگال میں مسلم لیگ سب سے بڑی واحد پارٹی کی حیثیت سے کامیاب ہوئی۔

پنجاب میں لیگ اور یونینسٹ پارٹی کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ سندھ میں مسلم لیگ نے بہت سی نشستیں حاصل کیں لیکن اکثریت نہ لے سکی۔

انتخابات کے بعد صوبوں میں وزارتیں بنانے کا مسئلہ سامنے آیا۔ میری خواہش تھی کہ ہر صوبہ میں، خواہ وہاں کانگریس اکثریت میں ہو یا نہ ہو، مسلم لیگ کے اشتراک سے وزارتیں بنائی جائیں۔ مسلم لیگ کے بہت سے سرکردہ افراد بھی اس کے حق میں تھے۔ لیکن مسٹر جناح نے کانگریس کے ساتھ اشتراک سے مسلم لیگ کے ارکان کو روک دیا۔

بہرحال ہندو مسلم نزاع تیز تر ہوتا رہا اور ہندوستان کا سیاسی مسئلہ سنگین نوعیت اختیار کرتا چلا گیا۔

کانگریس اور لیگ کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی میری کوششیں بارآور نہیں ہو سکیں۔

فروری ۱۹۴۶ء میں برطانوی حکومت نے ایک کابینہ مشن ہندوستان بھیجنے کا اعلان کیا جو ہندوستانی لیڈروں سے ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ پر گفت و شنید کرے گا۔

کابینہ مشن ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو ہندوستان پہنچ گیا۔ یہ مشن، لارڈ پیتھک لارنس، لارڈ اے، وی، الیگزینڈر اور سر اسٹافورڈ کرپس پر مشتمل تھا۔

۲ اپریل ۱۹۴۶ء کو میں دہلی پہنچا۔ اب معاملہ ہندوستان اور برطانیہ کے سیاسی اختلاف کا نہیں تھا۔ اس لیے کہ برطانیہ ہندوستان کو مکمل آزادی دینے پر تیار ہو چکا تھا۔

اب معاملہ فرقہ وارانہ اختلاف کا تھا۔ خاص طور پر مسلمانوں کے اندیشوں کا تھا!

• اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ مسلمان، ایک ملّت کی حیثیت سے اپنے مستقبل کے بارے میں متفکر تھے۔ وہ مجموعی اعتبار سے ہندوستان میں اپنے آپ کو ایک اقلیت تصوّر کرتے تھے اور خوفزدہ تھے کہ آزاد ہندوستان میں ان کی پوزیشن محفوظ نہیں رہے گی۔ اس مسئلہ پر میں نے مسلسل غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ وحدانی طرز کی حکومت کے بجائے اگر وفاقی اور عدم اکثریت کے نظام پر مبنی حکومت کا ڈھانچہ قائم کیا جائے جس میں اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں تو ایسا نظام اقلیتوں کے اندیشے رفع کر سکتا ہے۔

میں نے اس سلسلہ میں ایک فارمولا مرتب کیا جس کی رُو سے صرف دفاع، امورِ خارجہ اور رسل و رسائل کے محکمے مرکزی حکومت کے پاس ہوں اور باقی تمام اختیارات صوبوں کو دے دیئے جائیں۔ ہاں صوبے اپنے مفاد اور مرضی کے تحت بعد میں کچھ اور اختیارات مرکز کے سپرد کرنا چاہیں تو وہ ان کی اپنی صوابدید پر مبنی ہوگا! •

۶ر اپریل ۱۹۴۶ء کو میں کابینہ مشن کے ارکان سے ملا اور جب مشن کے ارکان نے مجھ سے فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لئے سوال کیا تو میں نے اپنا تیار کردہ فارمولا ان کے سامنے رکھ دیا۔

لارڈ پیتھک لارنس نے کہا کہ آپ نے تو اس مسئلہ کا ایک بالکل نیا حل پیش کیا ہے۔ سر کرپس نے بھی اس تجویز میں گہری دلچسپی لی اور اس پر اطمینان کا اظہار کیا۔

۱۲ر اپریل ۱۹۴۶ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا تو میں نے، کابینہ مشن کے ساتھ اپنی گفتگو کی رپورٹ پیش کی اور انہیں اپنے مجوزہ فارمولے سے مطلع کیا۔

گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کے ارکان نے میرے پیش کردہ فارمولے کی تفصیلات سُنیں اور اس سلسلہ میں متعدد وضاحتیں چاہیں۔ حتیٰ کہ سب کے سب

مطمئن ہو گئے۔

سردار پٹیل نے تجارت، کرنسی اور مالیات کے شعبوں کو صوبوں کے اختیار میں دینے پر بہت سے شبہات کا اظہار کیا۔ لیکن گاندھی جی اس فارمولے پر اتنے مطمئن ہو چکے تھے کہ خود انہوں نے سردار پٹیل کے ان شبہات کا جواب دیا۔

جب میں نے اپنی تجویز کابینہ مشن اور کانگریس دونوں کے سامنے رکھ دی اور انہیں مطمئن کر دیا تو پھر میں نے مناسب سمجھا کہ اسے ملک کے سامنے بھی پیش کروں۔ چنانچہ ۱۵ اپریل ۱۹۴۶ء کو میں نے ایک بیان جاری کیا جس کے مندرجات آج بھی (یعنی دس سال بعد) اپنی جگہ جوں کے توں نظر آتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ:

پاکستان کی اسکیم

"میں نے مسلم لیگ کی پاکستانی اسکیم پر ہر ممکن نقطۂ نگاہ سے غور کیا ہے۔ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے، پورے ہندوستان سے متعلق اس کی پیچیدگیوں کا میں نے جائزہ لیا ہے اور ایک مسلمان کی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کی قسمت پر پڑنے والے اس کے ممکنہ اثرات کا میں نے تجزیہ کیا ہے۔

اس اسکیم کے تمام پہلوؤں پر میں نے بہت کچھ غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ پورے ہندوستان کے لئے، اس اسکیم کے جو کچھ بھی نقصان ہیں، وہ اپنی جگہ، لیکن مسلمانوں کے لئے یہ تجویز سخت تباہ کن ثابت ہو گی۔ اور اس سے ان کی کوئی مشکل حل ہونے کے بجائے مزید مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

اوّل تو پاکستان کا لفظ ہی، میرے نزدیک اسلامی تصوّرات کے خلاف ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:-

"اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمین میرے لئے مسجد بنا دی ہے۔"

روئے زمین کو پاک اور ناپاک کے درمیان تقسیم کرنا ہی اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ دوسرے یہ کہ پاکستان کی اسکیم ایک طرح سے مسلمانوں کے لئے شکست کی علامت ہے۔

- -

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ۹ کروڑ سے زیادہ ہے۔ اور وہ اپنی اس زبردست تعداد کے ساتھ ایسی مذہبی و معاشرتی صفات کے حامل ہیں کہ ہندوستان کی قومی و وطنی زندگی میں پالیسی اور نظم و نسق کے تمام معاملات پر فیصلہ کن اثر ڈالنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ مزید برآں کئی صوبوں میں مسلمانوں کو مکمل اکثریت حاصل ہے۔

پاکستان کی اسکیم کے ذریعہ ان کی یہ ساری قوت و صلاحیت تقسیم ہو کر ضائع ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں ایک مسلمان کی حیثیت سے، ایک لمحہ کے لئے بھی میں اپنا یہ حق نہیں چھوڑ سکتا کہ پورا ہندوستان میرا ہے اور اس کی سیاسی و اقتصادی زندگی میں میری شرکت ناگزیر ہے۔

میرے نزدیک یہ بدترین بُزدلی کا نشان ہے کہ میں اپنی میراثِ پدری سے دستبردار ہو کر ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر قناعت کر لوں۔

- -

میں اس مسئلہ کے دوسرے تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر کے تنہا مسلم مفاد کے نقطۂ نگاہ سے بھی غور کرنے کے لئے تیار ہوں کہ اگر پاکستان کی اسکیم کو کسی طرح بھی مسلمانوں کے لئے مفید ثابت کر دیا جائے تو میں اسے قبول کر لوں گا اور دوسروں سے اسے منوانے پر اپنا پورا زور صرف کر ڈالوں گا!

مگر حقیقت یہ ہے کہ اس اسکیم سے مسلمانوں کے جماعتی اور ملّی مفاد کو ذرا

بھی فائدہ نہیں پہنچا اور ان کا کوئی اندیشہ بھی دور نہیں ہو سکتا۔

اب ذرا جذبات سے بالاتر ہو کر اس کے ممکنہ نتائج پر غور کریں کہ جب پاکستان بن جائے گا تو کیا ہو گا؟

ہندوستان دو ریاستوں میں تقسیم ہو جائیگا۔ ایک ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی۔ دوسری میں ہندو اکثریت۔

ہندو اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد ساڑھے تین کروڑ سے زائد ہو گی اور وہ بہت چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کی صورت میں پورے ملک میں بکھر کر رہ جائیں گے۔ یعنی آج کل کے مقابلہ میں وہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں اور زیادہ کمزور ہو جائیں گے جہاں ان کے گھربار اور بود و باش ایک ہزار سال سے چلی آ رہی ہے اور جہاں انھوں نے اسلامی تہذیب و تمدن کے مشہور اور بڑے بڑے مراکز تعمیر کئے ہیں۔

ہندو اکثریت کے علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کو ایک دن اس اچانک صورتِ حال سے سابقہ پیش آئیگا کہ ایک صبح آنکھ کھلتے ہی وہ اپنے آپ کو اپنے گھر اور وطن میں ہی پردیسی اور اجنبی پائیں گے۔ صنعتی، تعلیمی اور معاشی لحاظ سے پس ماندہ ہوں گے، اور ایک ایسی حکومت کے رحم و کرم پر ہوں گے، جو خالص ہندو راج بن گئی ہو گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

پاکستان میں خواہ مسلمانوں کی مکمل اکثریت کی حکومت ہی کیوں نہ قائم ہو جائے، اس سے ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کا مسئلہ ہرگز حل نہیں ہو سکے گا!

دو ریاستیں ایک دوسرے کی مدِ مقابل بن کر، ایک دوسرے کی اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنے کی پوزیشن میں نہیں آسکتیں۔ اس سے صرف یرغمال اور انتقام

کا راستہ کھلے گا عالمی معاملات میں بھی پاکستان کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کر پائے گا۔.................!

میرا فارمولا

ہاں جو فارمولا میں نے پیش کیا ہے اور جسے کانگریس سے منظور کرانے میں کامیاب ہوا ہوں، اس میں پاکستانی اسکیم کی تمام خوبیاں موجود ہیں اور وہ ان نقائص سے پاک ہے جو اس اسکیم میں پائے جاتے ہیں۔

دراصل پاکستان کی اسکیم اس خوف کا نتیجہ ہے کہ ہندو مرکز میں اکثریت میں ہوں گے اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں ان کی مداخلت ممکن ہے۔

میرے پیش کردہ فارمولے سے، جسے کانگریس منظور کر چکی ہے، اس خوف کا ازالہ اس طرح ہو جاتا ہے کہ تمام صوبائی وحدتیں مکمل خود مختار ہوں گی۔ مرکزی اختیارات کی دو فہرستیں ہوں گی۔ ایک لازمی اور دوسری اختیاری۔ مرکز کے پاس صرف وہ چند اختیارات ہوں گے جنہیں صوبے مرکز کو تفویض کریں گے۔ مابقیہ اختیارات صوبوں کے پاس ہوں گے۔

مسلم اکثریت کے صوبے اپنی صواب دید کے مطابق ان اختیارات کو استعمال کرنے میں آزاد ہوں گے اور مرکز کو سپرد کردہ معاملات پر بھی اپنا اثر ڈالنے کا حق رکھیں گے.........................؟

بہر حال کابینہ مشن اور کانگریس دونوں ہی سے میں نے اپنی وفاقی تجویز منظور کرائی جس کی رُو سے تمام صوبے مکمل طور پر خود مختار قرار دیئے گئے تھے اور صوبوں کی طرف سے صرف تین امور مرکز کو تفویض کئے جانے تھے۔ دفاع، امورِ خارجہ اور رسل و رسائل۔

چنانچہ کابینہ مشن نے ایک نئی تجویز کے اضافہ کے ساتھ میرے پیش کردہ فارمولے پر مشتمل اپنا منصوبہ پیش کر دیا۔ مشن نے جس نئی تجویز کا اضافہ کیا تھا ، وہ اے ، بی ، سی کے نام سے تین گروپ بنانے کی تھی۔

کابینہ مشن کا منصوبہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے ہی منظور کر لیا اور مجھے اطمینان ہوا کہ مسلمان مستقبل کے خطرات سے محفوظ ہو گئے اور ملک کی پُرامن آزادی کا راستہ صاف ہو گیا ہے۔

لیکن کہاں ؟ ہمارا یہ اطمینان محض سراب ثابت ہوا۔ ہوا یہ کہ میں ۷ سال سے کانگریس کا صدر چلا آ رہا تھا ، حالاں کہ دستور کے مطابق ہر سال نئے صدر کا انتخاب ہونا چاہیئے۔ لیکن ۱۹۳۹ء کے غیر معمولی واقعات و حالات کی بناء پر ایسا نہیں ہو سکا اور میں مسلسل ۷ سال کانگریس کی صدارت کا بار سنبھالے رہا۔

اب جب کہ ملک کے حالات رُو بہ اصلاح ہو چکے تھے ، آزادی کے منصوبہ پر کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے صاد کر دیا تھا ، میں نے مناسب سمجھا کہ میں کانگریس کی صدارت سے سبکدوش ہو جاؤں اور نئے صدر کا انتخاب کر لیا جائے۔

بہت کچھ غور و خوض کے بعد میں نے اپنے استعفے کا اعلان کر دیا۔ کانگریس کے بیشتر حلقوں کی طرف سے یہ اصرار جاری رہا کہ آئندہ مدت کے لئے بھی میں ہی صدارت کا عہدہ سنبھالے رہوں لیکن آئندہ صدارت کے لئے میں نے جواہر لال کا نام تجویز کیا۔

جواہر لال کانگریس کے صدر منتخب ہو گئے۔ ۱۰ جنوری کو انہوں نے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس بلائی اور اس میں کابینہ مشن پلان کے سلسلہ میں سوالات کے جوابات دیتے ہوئے اُن کی زبان سے ایک ایسا جملہ نکل گیا جس کی بناء پر مسٹر جناح کو یہ موقعہ ہاتھ آ گیا کہ وہ کابینہ پلان کی منظوری سے خود کو علیحدہ کر لیں۔

جواہرلال نے کہا تھا کہ کانگریس دستور ساز اسمبلی میں آزادانہ طور پر شرکت کرے گی وہ کابینہ پلان کی پابند نہیں ہوگی۔

جواہرلال کا یہ بیان یقیناً صحیح نہیں تھا لیکن پریس کے سوالات کے سیاق و سباق میں وہ یہ کہہ گئے۔

مسٹر جناح نے ۲۸ جولائی کو بمبئی میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بلا کر یہ اعلان کر دیا کہ چونکہ کانگریس کے صدر نے، کابینہ پلان کی پابندی سے آزاد رہنے کا اعلان کیا ہے اس لئے مسلم لیگ بھی اب اس منصوبہ کی پابند نہیں رہی۔

اس طرح ایک معمولی سی بات نے پھر کشیدگی کی خطرناک صورتِ حال پیدا کر دی۔ میں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلانے پر زور دیا جو ۸ اگست کو بلا لیا گیا۔ اور فوراً ایک قرارداد منظور کر کے جاری کر دی گئی جس میں واضح کر دیا گیا کہ کانگریس کابینہ مشن پلان منظور کر چکی ہے اور وہ اسکی پابند ہے۔ کسی ایک فرد یا چند افراد کے کسی جملہ یا بیان سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ملک و قوم کا مفاد سب سے بالاتر ہے۔

لیکن مسٹر جناح نے کانگریس کے اس اعلان کو تسلیم نہیں کیا اور پاکستان کے سوال کو پھر اٹھا کر ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ کر ڈالا۔ یہاں سے ان خونریز فسادات کا آغاز ہوا جس نے پورے ملک کے امن و سکون کو غارت کر کے رکھ دیا۔ نواکھالی اور کلکتہ میں فساد ہوا، بہار میں فساد ہوا، بمبئی میں فساد ہوا، گڑھ مکتیشر میں فساد ہوا۔ حتیٰ کہ پنجاب میں اور پورے ملک میں فساد پھیل گیا۔

اس دوران مرکز میں انٹرم حکومت بنی۔ کانگریس اس میں شامل ہوئی اور بعد میں مسلم لیگ بھی اس میں شامل ہو گئی۔

لیکن اب اتحاد اور امن کا دور ختم ہو چکا تھا۔

حتیٰ کہ لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے آخری وائسرائے

مقرر ہو کر آئے ۔ اور انھوں نے دھیرے دھیرے سردار پٹیل، جواہر لال نہرو، گاندھی جی وغیرہ کانگریسی رہنماؤں کو تقسیم کا نظریہ قبول کر لینے پر آمادہ کر لیا۔ بالآخر ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کو دو ریاستوں میں تقسیم کر دینے کی تجویز کا اعلان کر دیا گیا۔

یہ اعلان دراصل نہ ہندوستان کے مفاد میں تھا، نہ مسلمانوں کے مفاد میں، اس سے صرف برطانوی مفاد کی حفاظت مقصود تھی۔

اس لئے کہ ہندوستان کی تقسیم اور مسلمان اکثریت کے صوبوں کی الگ ریاست قائم کر دینے سے برطانیہ کو برصغیر میں اپنے پاؤں ٹکانے کا موقع حاصل ہو جاتا تھا۔ ایک ایسی ریاست جس میں مسلم لیگ کے نام سے، برطانیہ کے پسندیدہ افراد برسرِ اقتدار آ جائیں گے مستقل طور پر برطانیہ کے زیرِ اثر رکھی جا سکتی تھی اور اس کا اثر ہندوستان کے رویّہ پر بھی پڑنا لازمی ہوگا۔ ہندوستان جب یہ دیکھے گا کہ پاکستان میں برطانیہ کا اثر ہے تو وہ اپنے یہاں بھی برطانوی مفاد کا لحاظ رکھے گا جس کا دوسری صورت میں شاید وہ روادار نہ ہو۔

آخر کار ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان تقسیم کر دیا گیا۔ پاکستان اور ہندوستان کی دو آزاد ریاستیں وجود میں آ گئیں جو یکساں طور پر برطانوی کامن ویلتھ کی ممبر بننے پر راضی ہو گئیں۔

اور پھر میرے بدترین خدشات صحیح ثابت ہونے لگے ایک فرقہ دوسرے فرقہ کا بدترین دشمن بن کر قتلِ عام، غارت گری اور لوٹ مار پر اتر آیا، خون کی لکیروں کے ساتھ دو ملکوں کی سرحدیں کھینچی جانے لگیں اور مسلمان تقسیم در تقسیم ہو کر رہ گئے۔

پاکستان بننے کے بعد!

ہندوستان نے اگرچہ آزادی حاصل کر لی، لیکن اس کا اتحاد باقی نہیں رہا۔ پاکستان کے نام سے جو نئی ریاست وجود میں آئی ہے، اس میں برسراقتدار طبقہ وہ ہے:

جو برطانوی حکومت کا پروردہ رہا ہے!!

اس کے طرزِ عمل میں خدمتِ خلق اور قربانی کا کبھی کوئی شائبہ نہیں رہا ہے، اور صرف اپنے ذاتی مفاد کے لئے یہ لوگ پبلک کاموں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔

پاکستان کی نئی ریاست کے حاکموں اور عوام کے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ ان لیڈروں کو یہ بھی خطرہ ہے کہ اگر آزاد انتخابات عمل میں آئے، تو ان میں اکثر کے منتخب ہونے کا امکان ہی نہیں ہے۔ اس لئے وہ انتخاب ہی نہیں ہونے دے رہے ہیں۔

پاکستان* کے قیام کو (۱۹۵۷ء میں) دس برس گذر چکے ہیں اور بمشکل حال ہی میں (۱۹۵۶ء میں) ایک دستور مرتب ہو پایا ہے، لیکن کسے معلوم کہ نئے دستور کے تحت پہلے انتخاب عمل میں بھی آسکیں گے؟

پاکستان کے قیام کا ایک ہی نتیجہ نکلا ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی پوزیشن کمزور ہو کر رہ گئی۔ ہندوستان میں رہ جانے والے چار پانچ کروڑ مسلمان تو کمزور ہوئے ہی، لیکن خود پاکستان میں اب تک کوئی مستحکم حکومت قائم نہیں ہو سکی، اور نہ ایسی حکومت کے قیام کے آثار ہی نظر آتے ہیں۔

مسلمانوں کے مفاد کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو پاکستان کے قیام سے انھیں کوئی متوقع فائدہ حاصل نہیں ہُوا، اور ان کا ایک بھی مسئلہ حل نہیں ہُوا ــــ پاکستان کے قیام کے جواز کے لیے صرف یہ ہی بات کہی جا سکتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اتنے خراب ہو چکے تھے کہ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا ــــ جواہر لال وغیرہ کا یہی خیال ہے ــــ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ درست نہیں۔

میں نے جو اسکیم پیش کی تھی، اور جسے کابینہ مشن نے بڑی حد تک مان لیا تھا، اگر ہم اس پر ثابت قدم رہتے تو سب کے لیے بہتر نتائج نکلتے اور ہندوستان مستقبل کے خطرات سے محفوظ ہو جاتا۔

کیا پاکستان کے قیام سے، فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہو گیا ؟
کیا یہ مسئلہ اَب پہلے سے زیادہ شدید اور ضرر رساں نہیں بن گیا ہے ؟

• جب تقسیم کی بُنیاد ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان عداوت پر رکھی گئی تھی تو پاکستان کے قیام سے یہ منافرت ایک آئینی شکل اختیار کر گئی ہے، اور اس کا حل اَب اور مشکل ہو گیا ہے ــــ !!!

برّصغیر دو ریاستوں میں تقسیم ہو گیا ہے!

اور یہ دونوں ریاستیں ایک دُوسرے کو نفرت و ہراس کی نگاہوں سے دیکھتی ہیں

پاکستان سمجھتا ہے کہ ہندوستان اسے اطمینان سے جینے نہیں دے گا، اور جب بھی اسے موقعہ ملے گا، وہ اسے نیست و نابود کر دے گا۔
ہندوستان کو بھی یہ ڈر ہے کہ جب بھی پاکستان کو موقعہ ملا، وہ اس پر حملہ کرے گا۔

اس طرح دونوں ملک خوف و ہراس کے تحت اپنا فوجی خرچ بڑھاتے رہنے پر مجبور رہیں گے، اور معاشی ترقی سے محروم ہوتے چلے جائیں گے۔

پاکستان کا مستقبل

- بنگال کی علیحدگی کا امکان!
- پنجاب، سندھ، سرحد کے درمیان کشیدگی کا اندیشہ!

شاید مسٹر جناح اور ان کے ساتھی یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ جغرافیائی صورتِ حال ان کے موافق نہیں ہے۔ سارے برِصغیر میں مسلمان اس طرح بکھرے ہوئے تھے کہ صرف ایک ہی علاقہ میں ان کی جداگانہ ریاست کا قیام ممکن نہیں تھا۔ مسلمان مشرق اور شمال مغرب کے علاقوں میں اکثریت میں تھے۔ لیکن یہ دونوں علاقے کسی جگہ بھی ایک دوسرے سے ملحق نہیں ہیں اور یہاں کے باشندے مذہب کے سوا، ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔
یہ بات کہ صرف مذہبی یگانگت، دو ایسے علاقوں کو متحد رکھنے کے لیے کافی

ہے جو جغرافیائی، معاشی، لسانی اور معاشرتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں، فریب دہی اور خود فریبی سے کم نہیں ہے۔

بے شک اسلامی تعلیمات، نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حد بندیوں سے بالاتر ہیں، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کو چھوڑ کر، سارے مسلمان ممالک صرف اسلام کی اساس پر اپنے آپ کو متحد نہیں کر سکے۔

کون توقع کر سکتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اختلافات دور ہو جائیں گے اور یہ دونوں علاقے ایک قوم بن جائیں گے۔ مغربی پاکستان کے اندر بھی سندھ، پنجاب، سرحد اپنے اپنے جداگانہ مفاد و مقاصد کے لئے کوشاں رہیں گے۔

تاہم پاکستان کی نئی ریاست اب ایک حقیقت ہے اور ہندوستان و پاکستان دونوں کا فائدہ و سلامتی اس میں ہے کہ باہم دوستانہ تعلقات بڑھائیں اور اشتراکِ عمل کریں۔

اس کے خلاف کوئی پالیسی اپنائی گئی تو وہ نئے اور بڑے مصائب و آلام کا باعث بن سکتی ہے!!!

(۱۹۵۷ء تک)
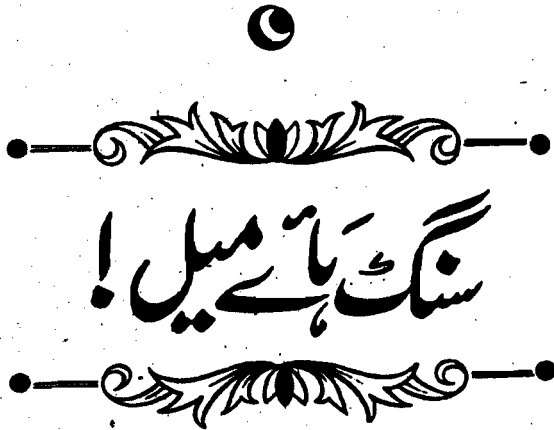
ارشادات

و

فرمودات

★

حقائق ومعارف

میرے عقیدہ میں ضرورت اور وقت جب حق کے ساتھ جمع ہو جائیں، تو پھر خدا کی بنائی ہوئی اس سقفِ نیلگوں کے نیچے کوئی شے ایسی نہیں جو اعلانِ حق کے لئے باعثِ مجبوری ہو سکے۔

اور اگر ہو تو تمھاری حِس کا قصور ہے۔ اعلان حق کے وجوب کا بطلان نہیں ہے ـــ میں موجودہ حالات کو کبھی بھی ایسی تعبیراتِ باطلہ سے مخفی نہیں کر سکتا، جس سے اس کی اصل حقیقت پر پردے پڑ جائیں۔

اگر تم کسی خوں چکاں نعش پر، ایک ریشمی لحاف ڈال دو گے تو کیا یہ ثابت کر سکو گے کہ وہ مُردہ نعش نہیں ہے۔؟

اللہ علیم ہے کہ مجھے سورج اور چاند کے وجود کا اتنا یقین نہیں ہے جتنا کہ حق کی کامیابی اور باطل کے خسران پر ایمان ہے۔

کوئی سچی بات اس لئے نہیں ترک کی جا سکتی کہ لوگ اس کا استقبال نہیں کریں گے۔ سچ سچ ہے اگرچہ تمام عالم میں اس کا ایک بھی دوست نہ ہو۔ سچائی کی فاتحانہ حقیقت پر میرا اعتماد ہے۔ اور اعلانِ حق، اور امر بالمعروف کا فرضِ شرعی، خوفِ ظنون و ہجومِ شبہات سے ساقط نہیں کیا جا سکتا ـــ!

اگر دنیا میں ایسے لوگ ہیں جن کو چراغ کی روشنی دھندلی نظر آتی ہے تو یہ ان کی آنکھوں کا ضعف ہے۔ ان کی خاطر چراغ گل نہیں کئے جا سکتے۔

ابوالکلام آزاد ـــــــــــــ ★

اعلانِ بغاوت اور عدالت

یہ سنہ ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے۔

ابھی ہندوستان کے کسی سیاسی لیڈر اور کسی سیاسی جماعت نے، کامل آزادی کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ ابھی انگریزی حکومت کے وجود کے خلاف کسی جماعت اور کسی لیڈر نے زبان نہیں کھولی تھی۔ ابھی کانگریس کے پلیٹ فارم سے آزادیِ کامل ریزولیشن اور مطالبہ پاس نہیں ہوا تھا ابھی مسلم لیگ جداگانہ وطن اور جداگانہ قوم کے تصور سے بھی آشنا نہیں تھی۔ ابھی سب جماعتیں صرف چند حقوق کے لئے انگریزی حکومت کے سامنے عرضداشتیں پیش کرتے رہنے کی روش پر گامزن تھیں کہ۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو چار سال کی نظربندی سے رہا ہونے کے کچھ عرصہ بعد، بغاوت کے جرم میں، انگریزی حکومت گرفتار کر لیتی ہے' اور ایک انگریز جج کی عدالت میں سزا دلانے کے لئے پیش کر دیتی ہے۔

برطانوی حکومت، جس کی حدود میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا، اس حکومت کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں کے جرم میں، ابوالکلام آزاد کو مجرموں کے کٹہرے میں لایا گیا۔

انگریزی حکومت کے قانون میں، اِس جرم کے مرتکب کیلئے پھانسی
یا کالے پانی کی سزا تھی۔

اس سزا کے خوف سے، لوگوں کی زبانیں مدّتوں سے گنگ تھیں،
لیکن آج ابوالکلام آزاد انگریزی حکومت کی انگریزی عدالت کے سامنے
بیان دیتے ہیں۔

اس عدالتی بیان کے بارے میں، گاندھی جی نے، جو اُس وقت ایک
صحافی تھے، اور "بمبئی کرانیکل" کے ایڈیٹر تھے۔ لکھا تھا کہ:

"مولانا آزاد کا یہ بیان، تحریکِ آزادی کی تاریخ میں بے مثال،
ولولہ انگیز اور عہد ساز ہے۔

اس بیان سے ہم نے ہندوستان کی جنگِ آزادی نصف سے
زیادہ جیت لی ہے۔

حاکم و جابر قوّتوں کا زعمِ استبداد، اِس بیان سے پاش
پاش ہو گیا ہے۔

غلام اور مضمحل قوموں کے لئے ۔۔۔ مولانا آزاد کا یہ بیان
آبِ حیات ہے!

ہندوستان اور ایشیا و افریقہ کی غلام قومیں، مولانا کو،
سلام کرتی ہیں۔

بے مثال، وَلولہ انگیز اور عہد ساز

مسٹر مجسٹریٹ!

"مجھ پر بغاوت کا الزام عائد کیا گیا ہے ـــــ لیکن مجھے بغاوت کے معنیٰ سمجھ لینے دو ـــــ کیا بغاوت آزادی کی اُس جدّوجہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں ہُوئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہُوں کہ میں باغی ہوں، لیکن ساتھ ہی یاد دِلاتا ہوں کہ اس کا نام قابلِ احترام حبّ الوطنی بھی ہے۔

"پارنل" نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ، ہمارا کام ہمیشہ ابتدا میں بغاوت اور آخر میں حبّ الوطنی کی مقدّس جنگ تسلیم کیا گیا ہے۔

میں مُسلمان ہُوں، اور میرے یقین کے لئے وہ بس کرتا ہے، جو میرے اللہ کی کتاب اور میرے نبی کی شریعت نے بتایا ہے۔

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گھڑی ہُوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خُدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لئے کیسے ہی خوش نما نام کیوں نہ رکھ لئے جائیں۔ لیکن وہ غلامی ہی ہے اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔

پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز تسلیم نہیں کرتا، اور اپنا مذہبی، انسانی اور ملکی فرض سمجھتا ہوں کہ اس محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں۔

جب اِسلام مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ ایسی مُسلمان حکومت کو بھی منصفانہ تسلیم نہ کریں جو قوم کی رائے اور انتخاب سے وُجود میں نہ آئی ہو، تو پھر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے اجنبی بیوروکریسی کیا حکم رکھتی ہے۔

اگر آج ہندوستان میں ایک خالص مُسلم حکومت قائم ہو جائے مگر اس کا نظام بھی شخصی ہو، یا چند حاکموں کی بیوروکریسی ہو تو بہ حیثیت مُسلمان ہونے کے اس وقت بھی میرا یہ ہی فرض ہو گا کہ اُس کو ظالم کہوں اور تبدیلی کا مطالبہ کروں۔

جن مُسلمانوں کے مذہبی فرائض میں یہ بات داخل ہو کہ موت قبول کر لیں، مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں، ان کے لئے دفعہ ۱۲۴ کا مقدمہ یقیناً کوئی بڑی ڈراؤنی چیز نہیں ہو سکتا۔

کیا صِرف اس لئے کہ ظلم طاقتور ہے، اور اس کے پاس جیل ہے، اس کا حق دار ہو جاتا ہے کہ اُس کا نام بدل دیا جائے۔

ہم صِرف اس لئے کہ تمھارے ساتھ عارضی طاقت ہے۔ تمھاری بُرائیوں کا انکار نہیں کریں گے۔

زیادہ سے زیادہ سزا جو دی جا سکتی ہے۔ بلا تامل دے دو۔ میں یقین دِلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہُوئے، جس قدر جنبش تمھارے قلم میں پیدا ہو گی، اس کا عشرِ عشیر اضطراب بھی سزا سُن کر میرے دِل کو نہیں ہو گا۔

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صِرف اس جرمِ بغاوت کا مجرم ہوں بلکہ اُن لوگوں میں سے ہوں، جنھوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دِلوں

میں تخم ریزی کی ہے، اور اس کی آبیاری کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ہے۔ میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں، جس نے ۱۹۱۲ء میں اپنی قوم کو اِس جرم کی عام دعوت دی، اور تین سال کے اندر اندر، اس غلامانہ روش سے ان کا رُخ پھیر دیا، جس میں گورنمنٹ کے پُر پیچ فریب نے انھیں مبتلا کر رکھا تھا۔

مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت عدالت کا نہ لوں گا، یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے، جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔

ہمارے حصہ میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے!

تمھارے حصہ میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی!

آؤ! اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں! مورخ ہمارے انتظار میں ہے، اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔

ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو، اور تم بھی جلد جلد فیصلے لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا، یہاں تک کہ ایک دُوسری عدالت کا دروازہ کھُل جائے۔

یہ خدا کے قانون کی عدالت!

وقت اس کا جج ہے،

وہ فیصلہ لکھے گا ــــــ اور اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہو گا۔"
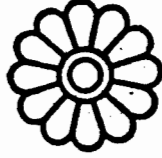
آل انڈیا

نیشنل کانگریس کے

پلیٹ فارم پر!

کانگریس کے سالانہ اجتماع رام گڑھ (۱۹۴۰ء)
میں، صدر کانگریس کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام
آزادؒ نے جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا وہ تاریخی
اعتبار سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔
آئندہ صفحات پر اس خطبے کے اہم ترین اقتباسات
پیش ہیں۔
یہ خطبہ ایک ایسے وقت میں دیا گیا تھا، جب
ساری دنیا، دوسری عالمی جنگ کی لپیٹ میں
آچکی تھی، اہلِ انگریز، برِصغیر کو بھی اس جنگ میں
زبردستی کھینچ چکے تھے۔
اس خطبہ میں، برِصغیر کے مسلمانوں کی حیثیت پر بھی
مولانا نے گفتگو کی ہے۔

خطبۂ صدارت

آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی ہولناکیوں میں دھکیلا جا رہا ہے۔ کیا معقولیت اور حقیقت کی موجودگی سے ہمیں اس قدر مایوس ہو جانا چاہیئے کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے، اور خود ہماری قسمت پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔

سوال برطانوی حکومت کی خواہش اور اس خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے، صاف اور سادہ سوال ہندوستان کے حق کا ہے، ہندوستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے۔ اس سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوالوں کا جواب موقوف ہے۔ ہندوستان کے لئے یہ سوال بنیاد کی اینٹ ہے۔ وہ اسے نہیں ہلنے دے گا۔ اگر یہ ہل جائے تو اس کی قومی ہستی کی ساری عمارت ہی ہل جائے گی۔

جہاں تک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے، ہمارے لئے صورتِ حال بالکل واضح ہو گئی ہے۔ ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی

صاف صاف دیکھ رہے ہیں۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتح مندیوں کے لئے لڑائی میں حصّہ لیں۔ ہمارا مقدمہ بالکل صاف ہے جب ہم اپنی محکومی کی عمر بڑھانے کے لئے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتح مند نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف انکار کرتے ہیں؛ ہماری راہ یقیناً اس کے مقابل سمت جا رہی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا مقام اور مستقبل

ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک و بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟

اگر پہلی صورت ہے تو بلاشبہ ہماری راہ بالکل دوسری ہو جاتی ہے وقت کا کوئی اعلان، آئندہ کا کوئی وعدہ، دستوریا ساسی کا کوئی تحفظ، ہمارے شک اور خوف کا اصل علاج نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ کسی تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اور ہمیں بھی یہی خواہش رکھنی چاہئیے کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے۔

لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں، اور اگر ہم اپنے مستقبل کو خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ تو پھر ہماری راہِ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ یہاں آکر، شک، تذبذب، بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی ——————

یقین، جہاد، عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔

وقت کا کوئی اُبھاؤ، حالات کا کوئی اُتار چڑھاؤ، معاملوں کی
چُبھن ہمارے قدموں کا رُخ نہیں بدل سکتی۔

ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں
قدم اٹھائے بڑھتے چلے جائیں۔

مجھے اِس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی
میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کر دیا۔ میرے
لئے ناممکن تھا کہ اس کا تصور بھی کر سکوں۔

میں کسی مسلمان کے لئے بشرطیکہ اس نے اسلام کی رُوح اپنے
دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈھ کر نکال نہ پھینکی ہو، یہ ممکن نہیں
سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت کرے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک
غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے
ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے
کھڑا ہے، کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان کرنا بھی اپنی نگاہ
کو صریح دھوکہ دینا ہے۔

اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک
کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی
نہیں ہے۔

اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے
نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے محفوظ رکھا ہے۔

کیا انسانی تعداد کی اتنی عظیم مقدار کے لئے، اِس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری، ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی نگہداشت خود نہیں کر سکے گی۔

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہُوئی نہیں ہے، بلکہ ایک خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصّوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صُوبوں میں سے چار صُوبے ایسے ہیں جہاں اکثریت مُسلمانوں کی ہے۔ اور دُوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کر دیا جائے تو چار کی جگہ مُسلم اکثریت کے پانچ صُوبے ہو جائیں گے۔

اگر ہم ابھی مجبُور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بناء پر ہی "اکثریت" اور "اقلیت" کا تصوّر کرتے رہیں، تو بھی اس نقشہ میں مُسلمانوں کی جگہ محض ایک "اقلیت" کی دِکھائی نہیں دیتی۔

وہ اگر چھ صُوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صُوبوں میں انھیں اکثریت کی جگہ حاصِل ہے۔

ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انھیں ایک اقلیتی گروہ ہونے کا احساس مضطرب کرے۔

میں مُسلمان ہُوں، اور فخر کے ساتھ محسُوس کرتا ہُوں کہ مُسلمان ہُوں اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں؛ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصّہ بھی ضائع ہونے دُوں اسلام کی تاریخ ــــ اسلام کی تعلیم ــــ اسلام کے علوم و فنون اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے۔ اور میرا فرض ہے کہ

اس کی حفاظت کروں۔

بحیثیت مسلمان ہونے کے، میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی خاص ہستی رکھتا ہوں، اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔

لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ، میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی رُوح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔

ہم اپنے ساتھ ذخیرہ لائے تھے، اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیئے۔

ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی، جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔

ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گذر چکی ہیں، اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے، جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا رہا ہے؛

۱۹۴۲ء میں مسلمانوں سے خطاب

۲۳ مارچ ۱۹۴۲ء کو، باغ بیرون دھلی دروازہ۔ لاھور میں لاکھوں مسلمانوں کے ایک عظیم اجتماع سے، جس کا اھتمام جمعیۃ علماء اور مجلس احرار نے کیا تھا، مولانا آزاد نے درج ذیل کلمات ارشاد فرمائے تھے :۔

" میں کل لاہور آیا تو مجھے ۱۹۲۱ء کا زمانہ یاد آگیا۔ جب کہ میں نے جمعیت علماء کے جلسہ کی صدارت کی تھی ۔

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت میرے عزم و ایمان کی جو صورت تھی، اس میں اب تک ذرہ بھر تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

وقت کے تقاضوں سے بعض باتوں میں تبدیلی ہو سکتی ہے، لیکن جن چیزوں کی بنیاد ہی ایک ٹھوس عقیدے اور حقیقت پر ہو، وہ نہیں بدلتے۔

میں نے ۱۸ برس کی عمر میں سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کیا تھا، چنانچہ اب تک اس پر قائم ہوں۔

میں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ میرے سامنے ایک چراغ جل رہا ہے اگر بیس لاکھ انسان بھی مجھے یقین دلانا چاہیں کہ چراغ نہیں جل رہا، تو

میں ایک مستقل حقیقت سے آنکھوں کو بند کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

ہندوستان غیر ملکی اقتدار کے پنجے میں جکڑا ہوا ہے، لیکن اب یہ پنجہ ٹوٹنے والا ہے۔

مسٹر چرچل غفلت کے دائرے میں محصور ہے۔ کاش یہ شخص برطانیہ کا وزیر اعظم ہونے کے بجائے کیمبرج یونیورسٹی کا پروفیسر ہوتا، تو گذشتہ تاریخ کو پیشِ نظر رکھ کر، زمانہ حال کے متعلق اپنی رائے قائم کرتا۔

اَب دُنیا کی قوموں کو غلام بنا کر نہیں رکھا جا سکتا۔

یہ خطرناک جنگ جب بھی ختم ہوگی، برطانیہ "عظمیٰ"، "عظمیٰ" نہیں رہے گا۔

ہندوستان بھی آزاد ہوگا، اور ایشیاء و افریقہ کے دُوسرے ملکوں کو بھی آزاد کرنا ہوگا۔

آج کا چین بدل چکا ہوگا، اور آج کا روس دُنیا کی بہت بڑی طاقت بن جائے گا۔

برطانیہ محض انگلستان تک محدود رہ جائے گا۔

اِس لئے وزیر اعظم برطانیہ مسٹر چرچل کے تمام دعوے کھوکھلے ہیں!!

مُسلمانوں کو اس فریب میں نہیں آجانا چاہیئے۔

انگریز بہادر نہیں بچ سکتا۔ اور نہ ہمیں بچا سکتا ہے، اسے بوریہ بستر باندھ کر یہاں سے جانا ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے، ہمیں مستقبل کے متعلق کیا فیصلہ کرنا چاہیئے؟

میں آنے والے زمانے کو کمزوری اور تذبذب سے نہیں دیکھتا بلکہ

عزم، ہمت اور حوصلہ سے دیکھ رہا ہوں ـــــــ جو قوم اپنے آپ کو بچانے پر قادر نہ ہو، اس کو تحفظات نہیں بچا سکتے۔

کاغذ کے پُرزوں پر لکھے ہوئے قانون محفوظ نہیں کر سکتے۔

مُسلمانوں کی تعداد دس کروڑ ہے، اگر دس کروڑ کے بجائے مُسلمان دس لاکھ بھی ہوتے ـــــــ اور ان کے دِل میں یہ خیال ہوتا کہ وہ مرنے کے لئے نہیں، زندہ رہنے کے لئے ہیں، تو کوئی قوم ان کو نہیں مٹا سکتی۔

ہندوستان میں آباد اتنی بڑی مُسلمان تعداد کو اقلیت قرار دینا، اور ان کے لئے اقلیتی حقوق اور اقلیتی علیحدگی کا مطالبہ کرنا، نہ صرف بزدلی ہے، بلکہ ان کے شان دار مستقبل کے لئے تباہ کُن ہے۔

میرے نزدیک ہندوستان میں مُسلمانوں کی حیثیت اقلیت کی نہیں، بلکہ دوسری بڑی اکثریت کی ہے۔

اور یہ اکثریت ہندوستان کی قسمت کے تمام سیاسی و اقتصادی و تمدنی فیصلوں میں برابر کی حق دار اور حصّہ دار ہے۔

پس میری جگہ، کمزوری اور تذبذب کی نہیں، بلکہ یقین اور ایمان کی ہے۔ لیکن اگر اتنی بڑی تعداد یعنی دس کروڑ کے ہوتے ہوئے بھی تم یہ خیال کرتے ہو کہ، فنا ہو جاؤ گے، مٹ جاؤ گے، ـــــ تو اس کا کیا علاج کہ دس کروڑ لاشوں کو، کوئی تحفظ اور کوئی دستور نہیں بچا سکتا۔

میرے سینے میں ایک انگیٹھی دہک رہی ہے۔ میں وہی حرارت آپ کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہوں۔

میرا ایمان اور میرا اسلام مجھے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ـــ اِن

حالات میں میرے لئے صرف ایک فرض رہ گیا ہے، اور وہ یہ ہے، کہ انگریزوں کی حکومت کے خلاف جو چولھا دہک رہا ہے، اُس میں لکڑیاں ڈالتا رہوں۔

میں کوئی ایسا سوال اٹھانا نہیں چاہتا، جس سے تیسری طاقت (انگریز) کے ہاتھ مضبوط ہوں۔

دُنیا میں وہی بچتا ہے، جس کے پاؤں کی نسیں مضبوط ہوں۔

میں آپ کو آئندہ نقشوں کے بھرنے سے نہیں روکتا۔

آل انڈیا کانگریس کی صدارت کے دو برس میں، میں نے جو کوششیں کیں، اور مسلمان لیڈروں نے جس طرح انھیں ٹھکرایا، ان کے بیان کرنے کا یہ موقعہ نہیں۔

لیکن جڑ کی چیز یہ نقشہ نہیں، درخت کو جڑ کی ضرورت ہے آپ اس ابتدائی مقدمہ اور اصول کو سمجھ لیں، تو سیکڑوں سوالات حل ہو جائیں گے ◆

"دس کروڑ کی آبادی (مسلمانوں) کو اقلیت قرار دینا بنیادی طور پر ایک غلط نظریہ ہے، جس کے تحت مسلمانوں کے دلوں میں احساسِ کمتری پیدا کیا جا رہا ہے"

● رام گڑھ میں، کانگریس کے سیشن ۱۹۴۰ء میں خطاب ●

پاکستان بننے کے بعد

جب
ہندوستان کے
مسلمانوں پر
خوف و
ہراس
کی فضا
طاری
ہوتی ہے، تو
مولانا ابوالکلام انھیں پکارتے ہیں،
حوصلہ دلاتے ہیں، اور پھر ہندوستان میں
مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے پیر جم جاتے ہیں!!

(جامع مسجد دہلی میں مسلمانانِ ہند سے ایک اہم خطاب)

اگست ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد، مشرقی پنجاب، دہلی اور یو۔پی سے بحرِ ہند کے ساحلی شہروں تک مسلمانوں پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی، ایمان ویقین اور عزم وعمل سے یکسر محروم ہو کر وہ فرداً فرداً اور گروہ در گروہ فرار ہونا شروع ہو گئے تھے ۔۔۔ معلوم ہوتا تھا، کہ پورے ہندوستان سے مسلمانوں کا نام ونشان مِٹ جائے گا۔

اسلام دشمن قوتیں فخر کے ساتھ، مسلمانوں کے اس اندوہناک انجام کا انتظار کر رہی تھیں۔

اس موقعہ پر دہلی کی شاہجہانی جامع مسجد سے، مولانا نے اپنی قوم وملّت کو للکارا، اور ایمان وعزم کی نئی قوت سے ان کے خالی سینے بھر دیئے۔

مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے پیر پھر جمنے لگے۔ اور آج وہ ہندو اکثریت کے ملک بھارت میں کم وبیش آٹھ کروڑ کی تعداد میں سینہ تانے سربلندی کے ساتھ آباد ہیں۔

- ان کی مسجدوں میں اذانیں گونجتی ہیں
- ان کے مدرسوں میں قرآنی آیات کی تلاوت جاری رہتی ہے، اور
- وہ اپنے دینی امتیازات کے ساتھ تاریخ کے قافلے کے پہلو بہ پہلو رواں اور دواں ہیں۔

اگلے صفحات پر، مولانا ابو الکلام آزاد کا یہ عظیم انقلابی خطبہ دیا جا رہا ہے۔

عزیزانِ گرامی!

آپ جانتے ہیں وہ کونسی چیز ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے!

میرے لئے شاہ جہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں ہے، میں نے اس زمانے میں جس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمھیں یہیں سے خطاب کیا تھا۔

جب تمھارے چہروں پر اضمحلال کے بجائے اطمینان تھا ـــــ اور تمھارے دِلوں میں شک کے بجائے اعتماد تھا۔

اور آج، تمھارے چہروں کا اضطراب اور دِلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں، تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔

تمھیں یاد ہے!

میں نے تمھیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ ڈالی۔

میں نے قلم اٹھایا، اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیئے۔

میں نے چلنا چاہا، تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے۔

میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی۔

حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست، جو تمھیں آج داغِ جُدائی دے گئی ہے، اس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمھیں خطرے کی

شاہراہ پر جھنجھوڑا۔ لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا، بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔

نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمھیں گھیر لیا، جن کا اندیشہ تمھیں صراطِ مستقیم سے دُور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو اب میں ایک جمود ہوں یا ایک دُور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گذاری ہے۔

اِس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لئے چن لیا تھا، وہاں میرے بال و پر کاٹ لئے گئے ہیں، یا میرے آشیانے کے لئے جگہ نہیں رہی ہے، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے ـــــ میرا احساس زخمی ہے، اور میرے دِل کو صدمہ ہے۔

سوچو تو سہی ـــــ تم نے کون سی راہ اختیار کی؟
کہاں پہنچے، اور کہاں کھڑے ہو؟

. . . .

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا، جب میں نے تم سے کہا تھا کہ ....
.... یہ ستون، جس پر تم نے بھروسہ کیا ہے، نہایت تیزی سے ٹوٹ رہا ہے۔

لیکن تم نے سُنی اَن سُنی برابر کر دی، اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمھارے لئے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔

تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمھیں بھروسہ تھا، وہ تمھیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔

وہ تقدیر جو تمہاری لغت کی منشاء سے مختلف مفہوم رکھتی ہے ___ یعنی تمہارے نزدیک فقدانِ ہمّت کا نام تقدیر ہے۔

. . . .

میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا، اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں ہے۔
لیکن اگر کچھ دُور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمہارے لئے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔

. . . .

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مُطابق انگڑائی نہیں لی، بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے۔
اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوف زدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی ہے، اور اس کی جگہ بُری شے آگئی ہے۔
ہاں تمہاری بے قراری اسی لئے ہے کہ تم نے اپنے تیئں اچھی شے کے لئے تیار نہیں کیا تھا، اور بُری شے کو ملجا و ماوٰی سمجھ رکھا تھا۔

. . . .

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاسیات کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے، میں نے کبھی اس پُرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لئے ہوتے ہوتی ہیں۔
لیکن آج مجھے جو کچھ کہنا ہے، بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔

پچھلے سات برس کی رُوداد دُہرانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں

. . . . ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے . . .

. . . . میرے لئے اس میں کوئی نئی بات نہیں، میں پچھلے دِنوں ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا ـــــ اَب ہندوستان کی سیاست کا رُخ بدل چکا ہے . . . اَب یہ تمہارے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے اندازِ فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں ؟ . . . . .

ہراس کا موسم عارضی ہے، میں تم کو یقین دِلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔

میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو ـــــ

شک سے ہاتھ اٹھالو۔ اور

بدعملی ترک کر دو۔

یہ تین دَھار کا انوکھا خنجر، لوہے کی اس دو دَھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے، جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سُنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو۔ اپنے دِلوں کو مضبوط بناؤ، اور اپنے دماغوں کو سوچنے کا عادی بناؤ، پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے [illegible] ہیں۔

آخر کہاں جا رہے ہو، اور کیوں جا رہے ہو؟

یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی

تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟

ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا، —— اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔

حالاں کہ دہلی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو!

اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔

جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمھارا جوش و خروش بے جا تھا اسی طرح آج تمھارا یہ خوف و ہراس بھی بے جا ہے۔

مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے، چند انسانوں کے چہرے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں، انھوں نے تمھیں جانے کے لئے ہی اکٹھا کیا تھا۔

آج انھوں نے تمھارے ہاتھ سے ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ تعجب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو کہ تمھارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے —— اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہیں تو،

انھیں اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ! جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا:

"جو خدا پر ایمان لائے، اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لئے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے، اور نہ کوئی غم ہے۔"

ہوائیں آتی ہیں اور گذر جاتی ہیں۔

یہ صرصر سہی، مگر اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔
ابھی دیکھتی آنکھیں ابتلاء کا موسم گذر جانے والا ہے۔
یُوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

عزیزو!

ستارے ٹوٹ گئے تو کیا ہُوا۔ سُورج تو چمک رہا ہے، اس سے کرنیں مانگ لو، اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو، جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تمھیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسہ سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو۔ اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو، جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا۔

میں کہتا ہوں کہ جو اُجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں۔ وہ تمھارے ہی قافلے کے چھوڑے ہوئے ہیں۔

انھیں بھلاؤ نہیں! ۔۔۔۔۔۔ ان کے وارث بن کر رہو! اور سمجھ لو! کہ اگر تم خود بھاگنے کے لئے تیار نہیں تو پھر تمھیں کوئی طاقت نہیں بھگا سکتی۔

آؤ! عہد کرو! کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اس کے لئے ہیں، اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے،

آج اندھیروں سے کانپتے ہو! کیا یاد نہیں کہ تمھارا وجود ایک

اُجالا تھا ـــــــ یہ بادلوں نے نیلا پانی برسایا ہے، اور تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں۔

حالانکہ وہ تمھارے ہی اسلاف تھے،

- جو سمندروں میں اُتر گئے۔
- پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔
- بجلیاں آئیں تو ان پر مُسکرا دیئے۔
- بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔
- صَرصَر اُٹھی تو اُس کا رُخ پھیر دیا۔
- آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمھارا راستہ یہ نہیں ہے۔

یہ ایمان کی جاں کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے۔

اور خدا سے اِس درجہ غافل ہو گئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا ـــ!

عزیزو!

میرے پاس تمھارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے، وہی پُرانا نسخہ ہے جو برسوں پہلے کا ہے۔

وہ نسخہ، جس کو کائناتِ انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا

وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین ؟

آج کی صحبت ختم ہو گئی، مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ میں اختصار کے ساتھ

کہہ چکا۔ پھر کہتا ہوں، اور بار بار کہتا ہوں:
اپنے حواس پر قابو رکھو!
اپنے گرد وپیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔
یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمھیں خرید کر لا دوں!
یہ تو دِل کی دُکان ہی میں اعمالِ صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ!

"کون توقع کر سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے اختلافات دُور ہو جائیں گے، اور یہ دونوں علاقے ایک قوم بن جائیں گے؟ ——— خود مغربی پاکستان کے اندر سندھ، پنجاب، سرحد (بلوچستان) اپنے اپنے جُداگانہ مفاد اور مقاصد کے لئے کوشاں نہ ہوں گے؟۔

بہرکیف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پاکستان کی نئی ریاست ایک حقیقت ہے ——— اب دونوں ریاستوں (پاکستان اور ہندوستان) کا مفاد اسی میں ہے کہ یہ ایک دُوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھائیں اور اشتراکِ عمل سے کام لیں۔ اس کے خلاف کوئی پالیسی اپنائی گئی۔ تو وہ نئے اور بڑے مصائب وآلام کا باعث بن سکتی ہے"

(مولانا کی آخری اور انگریزی کتاب انڈیا ونز فریڈم
——— مارچ ۱۹۵۸ء سے ایک اقتباس)

تقسیمِ ملک اور قیامِ پاکستان کے بعد لکھنؤ میں ــــــ مسلمانانِ ہند کے پہلے عظیم نمائندہ اجتماع سے خطاب

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو، برِ صغیر کی سیاسی تقسیم عمل میں آگئی ــ پاکستان بن گیا ــ بھاگنے والے بھاگ بھاگ کر پاکستان آنے لگے اور ہندوستان میں رہ جانے والے کروڑوں مسلمان جو امرتسر سے مدراس تک ایک طرف اور دہلی سے کلکتہ و بمبئی تک پھیلے ہوئے پڑے تھے، دفعتاً اپنے مستقبل سے مایوس ہوگئے اور اضطراب کے عالم میں سراسیمہ رہ گئے۔

اتنی بڑی تعداد بھاگ کر پاکستان کس طرح پہنچ سکتی ہے؟ پاکستان میں، اتنی بڑی تعداد کی گنجائش کیسے نکل سکتی ہے؟ ــ ہندوستان میں رہتے ہوئے اب ان مسلمانوں کا کیا بنے گا؟ ہندو فرقہ پرستوں کی یلغار کا نشانہ بننے سے وہ کیسے بچ سکیں گے؟ قتل و غارت گری کا جو طوفان پھٹ پڑا ہے اس سے کیسے نجات پا سکیں گے؟ کیا ہندو مسلم بنیاد پر، ملک کی تقسیم کے بعد، ہندوستان میں مسلمانوں کا ملّی وجود، ان کا مذہب، ان کی دینی تعلیم، ان کی معاش و معیشت، محفوظ رہ سکیں گے؟ کیا اسلام کے نام پر' پاکستان بن جانے کے بعد' بقیہ ہندوستان میں ہندو مذہب کو مکمل غلبہ و تسلط حاصل نہیں ہو جائے گا؟ اور ایک سیکولر

ملک کے بجائے، ہندوستان میں خالص ہندو راج کا
قیام عمل میں نہیں آجائے گا؟
آخر مسلمانوں کا کیا بنے گا؟ یہ تھے وہ سوالات
جنھوں نے ہندوستان میں رہ جانیوالے کروڑوں
مسلمانوں کو سخت بے چین اور مضطرب بنا ڈالا تھا
چنانچہ ان مسلمانانِ ہند نے، ان ہی مولانا ابوالکلام
آزاد کی طرف یک بارگی رجوع کیا، جن کو وہ "شوبوائے"
کہہ کر، عرصہ ہوا مسترد کر چکے تھے۔ لکھنؤ میں،
پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک عظیم نمائندہ
کانفرنس بلائی گئی جس میں لیگی، غیر لیگی اور تمام مسلمان
فرقوں کے نمائندے جمع ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد
کو، اس اجتماع کی صدارت کے لئے، مدعو کیا گیا۔
۲۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کو، وکٹوریہ گراؤنڈ لکھنؤ
میں سہ پہر کے وقت، لاکھوں مسلمانوں کے اس عظیم
اجتماع سے، حضرت مولانا نے خطاب کیا۔ اس خطاب
کی جھلکیاں ذیل میں ملاحظہ فرمایئے:

حضرات!
مجھے اس وقت کچھ باتیں آپ سے کہنی ہیں۔ لیکن میں سوچ
رہا ہوں کہ کہانی شروع کروں تو کہاں سے — ع
کجا بکشائیم
آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے چند ماہ کے اندر نہایت تیزی کے ساتھ انقلاب انگیز

واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ہر واقعہ کی کڑی دُوسری کڑی کے ساتھ جُڑی ہوئی ہے۔ ایک کو دُوسری کے ساتھ ملا کر واقعات کی زنجیر تیار ہو سکتی ہے۔

لیکن ان چند مہینوں میں جو کڑیاں جُڑیں اور جو زنجیر تیار ہوئی، معاملہ اس پر ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ حالات کو تولنے کے لئے پچھلے دس برس کی سُراغ رسانی کرنی پڑتی ہے۔ اِس مدت میں ایک کے بعد ایک واقعہ اُبھرتا رہا اور ڈھلتا رہا حتیٰ کہ زنجیر تیار ہو گئی ——— دس برس کے تاریخی لیل و نہار کی زنجیر۔

جب صدر استقبالیہ تقریر کر رہے تھے، تو میں ایک خاص فکر میں، ڈوبا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں کیا طرزِ عمل اختیار کروں۔ ایک ہی کڑی کو لُوں، تو واقعات ادھورے رہ جائیں گے۔

اگر پچھلے دس برس کے واقعات کی رفتار پر نظر ڈالوں اور انھیں بیان کروں تو یہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ پچھلی بحثیں اُبھریں تلخیاں پیدا ہوں۔

ضروری ہے کہ بہت احتیاط کے ساتھ قدم اٹھاؤں ——— اور رفتار پر تلخیوں کی کوئی پرچھائیں نہ پڑے۔

واقعات کی نوعیت ایسی ہے کہ ان میں بہت سے لوگوں کے لئے ملامت کا رنگ و روغن بھی ہے۔

لیکن میں آج کسی مسلمان کی ملامت کے لئے نہیں آیا۔ ملامت کس کو کریں؟ — اپنے بھائیوں کو؟ — اپنے عزیزوں کو؟ — آخر کس دیوار سے سر ٹکرائیں؟ — اور کیوں؟ ———

میں نے کوشش کی ہے کہ خاص طرح کا دماغ لے کر آؤں — اور آپ کا بھی ویسا ہی دماغ بن جائے۔

ہمیں محض وقت کے حالات کا تقاضا پورا کرنا چاہیئے اور بس !

اِن واقعات کو بھلا دیجئے اور جلا دیجئے، جنھیں قلم لکھ چکا ـــ۔ اور سیاہی سُوکھ چکی ہے۔

واقعات کا تقاضا کیا ہے؟

یہ کہ آج جب چاروں طرف خاص قسم کے حالات بکھرے ہوئے ہیں، اوران حالات نے ہمیں گھیرے میں لے لیا ہے ـــ

دیکھنا یہ ہے کہ اِس آب و ہوا میں، وہ کونسا رُخ ہے جو مسلمانوں کے لئے صحیح راستہ ہو سکتا ہے؟

یہ سوال میرے سامنے تو کوئی نیا نہیں ہے۔ اِس لئے جواب بھی نیا نہیں ہے۔ یہ گتھی بارہا میرے ناخنوں سے چھوتی اور سُلجھتی رہی ہے۔ میرا حل پُرانا ہے۔ اِس حل کو ۲۵ بلکہ ۳۰ برس سے میں آپ کے سامنے رکھتا آیا ہوں ـــ!

آج بھی اِس ملک میں وہ لوگ موجود ہیں، جو میرے ہم رائے ہیں! بڑی تعداد اُن عزیزوں کی ہوگی، جو مجھ سے اختلاف رکھتے تھے۔

لیکن حالات کی تبدیلی نے ان کی رائے کا رُخ بھی موڑ دیا ہے۔

ممکن ہے اَب بھی کچھ لوگ اپنی پرانی رائے پر قائم ہوں۔ لیکن اِن حالات میں، جو پیش آچکے، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کی رائے، جو اُس وقت ان کے خیال میں صحیح تھی، کم از کم اب کاملاً تبدیلی کی مستحق ہے۔

ورنہ نہ تو ہم قومی زندگی کو بچا سکتے ہیں، اور نہ ان تعمیروں میں حصہ لے سکتے ہیں، جو ہمارے لئے ضروری بلکہ بنیادی ہیں۔

اِس بارے میں جو ضِد کرتا ہے، وہ ملکی بربادی کی اینٹیں چُنتا ہے، اور

دیواریں اُٹھانا چاہتا ہے۔

میرا مشاہدہ ہے ، جیسے میں آپ کو دیکھ رہا ہوں ، اسی طرح یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ اس سے بڑھ کر خطرناک کوئی شے نہیں ہے کہ ہم پرانی روش پر ٹھہر جائیں۔

یہ حالات کی پکار ہے کہ جس دروازے سے یہ خطرناک واقعات آتے ہیں ، وہ دروازہ بند ہو جائے ـــــــ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو پھر خرابی کی ذمّہ داری لینی چاہیئے ۔ مگر یہ بہت بڑی ذمّہ داری ہو گی۔

۱۵ر اگست کے بعد ، لیگ کے ذمّہ دار افراد مجھ سے ملے ، انھوں نے کہا اَب مُسلم لیگ کی پہلی پالیسی اور ڈھنگ نہیں رہنا چاہیئے ۔ وہ مُصر تھے کہ اس کی لیڈر شپ بدل دی جائے ، اور میں لیگ کی باگ ہاتھوں میں لے لوں۔ لیکن میں نے ان سے کہا ، میں ایک لمحے کے لئے بھی اپنے دماغ کو اس کے لئے تیار نہیں کر سکتا۔

سوال کسی انجمن ، اس کے ڈھنگ ، اس کے مشرب ، اس کے مَسلک اور اس کی لیڈر شپ بدلنے کا نہیں۔

یہ ایک ، دو ، چار شاخیں اپنی جگہ کیسی ہی کیوں نہ ہوں ، معاملہ اس سے زیادہ گہرا ہے۔

سوال کو یوں دیکھئے کہ ملک میں ایک انجمن موجود ہے ، جس کا ضمیر فرقہ پرستی سے بنا ، بنیادیں فرقہ پرستی سے اُٹھیں ، دَروازوں کے تختے فرقہ پرستی کی چوب سے تیار کئے گئے ، تاریخ بھی یہیں سے بنی اور روایتی زندگی بھی اسی سانچے میں ڈھلی۔

میری رائے میں ، کوئی ہاتھ بھی ایسی انجمن کو ، اس کی روایتی زندگی سے

الگ نہیں کرسکتا۔

فرض کیجئے آپ نے اس کو بدلا، لیکن انجن بھی وہی، تاریخ بھی ہمراہ، دیواریں بھی ساتھ، ضمیر بھی موجود اور روایات بھی سامنے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس انجن پر کوئی اثر ڈالا جا سکتا ہے، میری رائے میں کوئی اثر نہیں ڈالا جا سکتا۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آئندہ کے لئے صاف اور دوٹوک فیصلہ کریں، تو کوئی جماعت جو سیاسی نظام میں فرقہ بندی کی بنا پر قائم ہو، موجود نہیں رہنی چاہیئے کہ پولیٹیکل میدان میں فرقہ پرستی ملک کے لئے بھی، اور ملت کے لئے بھی زہر قاتل ہے۔

★ صرف ایسی فرقہ وار جماعتیں ہونی چاہئیں جو مذہبی، تعلیمی، اور تمدنی معاملات سے متعلق ہوں۔

یہ خانہ ضروری ہے اور اس کو لازماً بھرنا چاہیئے۔

میں زیادہ واضح الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، انھیں ہندوستان کے آسمان کی اس نیلی چھت کے نیچے فرقہ پرستی کا نظام نہیں رکھنا چاہیئے۔

یہ میرا سوچا سمجھا ہوا مشورہ ہے۔

ملک کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے، اور ملک کے مستقبل کی خاطر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ فرقہ پرستی، جو مذہب کے نام سے اُبھاری گئی ہے ملک کی سیاسی زندگی سے نکال دی جائے۔

آج بھی میرا مشورہ یہ ہی ہے۔ آج سے پہلے نہ کر سکے تو یہ حجت نہیں کہ آج بھی نہ کریں۔

مسلم لیگ نے ایک مقصد قرار دیا۔ اس کے لئے اپنے اندازوں کے مطابق جدّوجہد کی۔ وہ مقصد صحیح تھا یا غلط؟ —— میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں اسے آج بھی غلط سمجھتا ہوں، جیساکہ پہلے سمجھتا تھا۔ لیکن یہ چیز خواہ اچھی تھی یا بُری، بہرحال کانگریس نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ اور یہ فیصلہ ہو گیا۔

یہ کاغذ کا فیصلہ نہ تھا، بلکہ اس کو عمل کا جامہ پہنا دیا گیا۔

اندریں حالات جو لوگ تقسیم کی جدّوجہد کے قائل تھے، انھیں ان کا مطمحِ نظر مل گیا۔

اس کے بعد، انڈین یونین میں، اس جدّوجہد کی علم بردار جماعت کی کوئی جگہ باقی نہیں رہتی، اور اس کا قائم رکھنا غیر ضروری ہو جاتا ہے۔

اَب بھی اگر فرقہ پرستی کا یہ دروازہ بند نہ ہوا، تو ردِّعمل کا جو سیلاب بہہ نکلا ہے، اسے بند لگانا انسانی اختیار سے باہر کی چیز ہوگا۔

خیر جوں ہی آپ اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ فرقہ پرستی نہیں رہنی چاہیئے تو سوال پیدا ہوگا کہ مسلمان* کیا کریں؟

پھر ان کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ غیر فرقہ وار سیاسی جماعتوں میں شامل ہوں، جو سب کی مشترک اور سیاسی و اقتصادی آزادی کی نقیب ہوں۔

آپ ایسی کوئی بھی انجمن منتخب کر سکتے ہیں +

انجام کیا ہو گا؟

آپ مادرِ وطن چھوڑ کر جا رہے ہیں، آپ نے سوچا اس کا انجام کیا ہو گا؟ ـــــ آپ کے اِس طرح فرار ہوتے رہنے سے، ہندوستان میں بسنے والے مُسلمان کمزور ہو جائیں گے۔ اور ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب پاکستان کے علاقائی باشندے اپنی اپنی جُداگانہ حیثیتوں کا دعویٰ لے کر اُٹھ کھڑے ہوں ـــ بنگالی ـــ پنجابی ـــ سندھی ـــ بلوچ ـــ اور پٹھان خود کو مستقل قومیں قرار دینے لگیں۔

کیا ـــ اُس وقت آپ کی پوزیشن، پاکستان میں بِن بُلائے مہمان کی طرح نازک اور بے کسانہ نہیں رہ جائے گی؟ ـــ ہندو آپ کا مذہبی مخالف تو ہو سکتا ہے، قومی اور وطنی مخالف نہیں ـــ آپ اس صُورتِ حال سے نمٹ سکتے ہیں۔

مگر پاکستان میں آپکو کسی وقت بھی، قومی اور وطنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑ جائے گا ـــ جن کے آگے آپ بے بس ہو جائیں گے ـــ!"

(یو۔پی سے پاکستان جانے والے ایک گروپ سے گفتگو
بحوالہ اخبار "وطن" دہلی۔ مارچ ۱۹۴۸ء)

كل من عليها فان، ويبقىٰ وجه ربك ذو الجلال والاكرام

موت

ایک

زمانے کی

نہیں!

کئی

زمانوں کی

موت!

مولانا ابوالکلام آزاد ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو وفات پا گئے

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۝

مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا!

آنسو بہاتے ہیں:

جمال عبدالناصر ــــ سابق صدر متحدہ عرب جمہوریہ

ڈاکٹر ذاکر حسین ــــ سابق صدر ہندوستان

برٹرنیڈ رسل ــــ مشہور برطانوی فلسفی

عصمت انونو ــــ سابق صدر ترکیہ

سٹانن بسی ــــ مشہور برطانوی مورخ

حکومت روس کا بیان

جواہر لال نہرو ــــ وزیر اعظم ہند

ڈاکٹر رادھا کرشن ــــ سابق صدر ہندوستان

خان عبدالغفار خان ــــ پختون رہنما!

حکومت چین کا بیان

اور ــــــــ

دُنیا کے ہزارہا سرکردہ افراد میں سے

چند ایک کے تاثرات !!!

مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا!

مصر کے مرحوم صدر جمال عبد الناصر کا نوحہ

آہ! روشنی کا مینار، اور عزم و حوصلہ کا سرچشمہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم اہلِ مشرق اپنی تاریک راہوں کو کس چراغ سے روشن کر سکیں گے۔ اور مغرب کی سامراجی قوتوں سے کس طرح اپنا لوہا منوا سکیں گے۔

مصر ۱۹۵۶ء کے نہر سوئیز کے معرکہ میں اپنی کامیابی پر سب سے زیادہ مولانا ابو الکلام کا شکر گذار ہے۔

وہ عرب اور ایشیائی اقوام کی آزادی کے سب سے بڑے علم بردار تھے، عرب دنیا اور ایشیا نے، گذشتہ پچاس سال میں جو کچھ حاصل کیا، وہ مولانا ابو الکلام کی سعی مشکور کا ہی نتیجہ ہے۔

ہندوستان کے اس غم میں ہم اہلِ مصر اور اہلِ عرب پوری طرح شریک ہیں۔

جمال عبد الناصر

ایک مشہور عرب اہلِ قلم کی آہ وفغاں!

"علم آج سیہ پوش اور ماتم کناں ہے، علم کا شہسوار مر گیا ہے
اَب دِل ودماغ کی تِشنگی کہاں سے بُجھائی جائے گی؟
آہ! دُنیا پر کیا اِس سے بڑا بھی کوئی سانحہ گذرا ہے؟

هیکل

ہندوستان کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے احساسات

"میں مولانا کے ساتھی ہونے کا فخر نہیں رکھتا ہوں۔ میں ان کے
ایک حقیر چیلا ہونے کا فخر رکھتا ہوں۔
آدمی بڑا ہو یا چھوٹا، اپنی زندگی بنانے کے لئے کہیں نہ کہیں سے
روشنی اور گرمی لیتا ہے۔
جب میں ایک لڑکا ہی تھا، اپنی زندگی کے دیئے کو سُلگانا چاہتا
تھا۔ اور لوگوں کی طرح میں نے بھی بتیاں بنائی تھیں، اور اپنی زندگی
کے تیل میں ان کو ڈالا تھا، اور ڈھونڈتا پھرتا تھا کہ ان کو کہاں سے
جلاؤں۔
اِس زندگی کی پہلی بتی، اُس دِیئے کی پہلی بتی، میں نے مولانا
کے دِیئے سے ہی جلائی تھی ـــــ!
ایک طالبِ علم کی حیثیت سے، میں ان کا "الہلال" پڑھتا تھا، اور
جب میں اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر اس کو پڑھتا تھا ـــــ اور انھیں

سُناتا تھا۔ اُس وقت اِس بتی میں آگ لگی تھی، لیکن آج میں اقرار کرتا ہوں کہ پہلی آگ انھیں سے لی تھی۔

ذاکر حسین

برطانیہ کے مشہور فلسفی برٹرنیڈ رسل کے تاثرات

"یہ خبر سُن کر (مولانا ابوالکلام کی وفات کی خبر) مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں یکہ و تنہا رہ گیا ہوں، جیسے وہ دریا خشک ہو گیا جس کی موجوں سے ہمیں ذہنی اور فکری سرور حاصل ہو جایا کرتا تھا۔

فیثاغورث، سقراط اور ہیگل کے بعد شاید یہ سب سے بڑے انسان کی موت ہے!"

برٹرنیڈ رسل

ترکی رہنما کا خراجِ تحسین

"ترک عوام انھیں نہیں بھلا سکتے۔ جنگ بلقان اور پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء) کے موقعہ پر ایشیا کے وہ واحد شخص تھے، جنھوں نے نہایت دلیری اور بے باکی کے ساتھ ترکوں کی حمایت کی، اور اِس حق گوئی کی پاداش میں انگریزوں کی قید و بند کی سختیاں برداشت کیں۔ وہ ترک عوام کو اتنے عزیز تھے کہ ایک بار انھیں ترکی میں آکر قیام کرنے اور ترکوں کی رہنمائی کرنے کی دعوت تک دی گئی۔

ترکی اپنی آزادی اور بقا کی جدوجہد میں ان کی حمایت کو ہمیشہ قدر و احترام کی نظر سے دیکھتا رہے گا۔

ان کی وفات سے ہمیں بھی اتنا ہی صدمہ پہنچا ہے جتنا اہلِ ہند کو۔

عصمت انونو

مشہور برطانوی مورّخ ٹائن بی

"تاریخ کی گتھیاں سلجھانے والا ہاتھ شل ہوگیا۔ ماضی حال اور مستقبل پر دُور تک نظر رکھنے والا چلا گیا۔

ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا ایک ایسی روشنی سے محروم ہوگئی، جس سے انسانی تاریخ کی پُرپیچ اور تاریک راہوں کا سُراغ لگانا ممکن ہو جاتا تھا۔"

ٹائن بی

حکومتِ رُوس کا تعزیتی بیان!

"مولانا ابوالکلام آزاد کی موت کا غم ہندوستان ہی کو نہیں، بلکہ رُوس کے عوام کو بھی ہے۔ وہ ایسے مجاہد تھے جنھوں نے دُنیا کی سب سے بڑی استبدادی قوت، برطانیۂ عظمیٰ کے خلاف سب سے پہلے علمِ جہاد بلند کیا۔ اور ظالم کے خلاف مظلوموں کی صف بندی کی۔

انقلابِ رُوس کے رہنماؤں نے ان کی پُرجوش جدوجہدِ آزادی سے

بہت زیادہ حوصلہ پایا تھا۔

روس میں انقلاب کی کامیابی ان کی صدائے انقلاب کی بھی رہینِ منت ہے،۔ روس کے عوام اس عظیم انسان کو سلام کرتے ہیں"

(اخبار "پرواوا"۔ مارچ ۱۹۵۸ء)

جواہر لال نہرو سابق وزیر اعظم ہند کا خراج عقیدت

"ممتاز افراد کے انتقال پر یہ کہنا بڑی رسمی سی بات ہو کر رہ گئی ہے کہ اب ان کی جگہ پُر نہ ہو سکے گی ــــ مگر جہاں تک مولانا ابوالکلام کے انتقال کا تعلق ہے' یہ بات سو فی صد صحیح ہے۔

یہ ہی نہیں کہ میں نے مولانا کے علم و فضل سے استفادہ کیا ہے بلکہ بسا اوقات حضرت مولانا کے علم و مطالعہ کے سامنے مجھے اپنا علم دریا کے سامنے پانی کا قطرہ دِکھائی دیا ہے۔

مولانا آزاد جیسی عظیم شخصیت کا دوبارہ پیدا ہونا ممکن نہیں ہے ــــ میں اَب کسی ایسے شخص کا تصور نہیں کر پا رہا ہوں جو ان کی جگہ لے سکے۔

مولانا کی بصیرت و دانشوری کا مقابلہ، یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے عہد کے دانشوروں سے کیا جا سکتا ہے۔

روزنامہ "نئی دنیا" دہلی

بھارت کے مشہور فلسفی اور سابق صدر
ڈاکٹر رادھا کرشن کا بیان !!!

" مولانا آزاد ایک بہت بڑے سیاست داں تھے، مفکر تھے، اسکالر تھے، اور پکے مسلمان تھے۔
ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے بحث کرنا ممکن نہیں ہے "

گووند ولبھ پنت کا خراج عقیدت!

" ایک عظیم انسان، جو ہر لحاظ سے عظیم تھا، ہم سے جدا ہو گیا۔ مولانا آزاد جیسی ہستی ہمیں پھر کبھی دیکھنے کو نہیں ملے گی "

وی ۔ وی ۔ گری سابق صدر ہند

" مولانا آزاد اعلیٰ درجہ کے مدبّر تھے، ان کے لئے کسی بھی مشکل مسئلہ کو حل کرنا مشکل نہیں تھا "

جناب سید فضل علی، سابق گورنر آسام

" پیچیدہ مسائل کا مناسب حل تلاش کرنے کی جو بے نظیر خوبی

مولانا آزاد میں تھی، وہ قوم کے لئے ایک دولت تھی۔"

پروفیسر اچاریہ کرپلانی، سابق صدر کانگریس

"مولانا کی شخصیت بہت بڑی تھی، وہ تاریخی شخصیت نہیں تھے، بلکہ یوں کہیئے کہ ان کی شخصیت میں تاریخ کا ایک زمانہ پنہاں تھا۔

جو صفتیں دوسرے آدمیوں میں الگ الگ پائی جاتی تھیں، وہ سب اس شخصیت میں جمع ہو گئی تھیں۔

وہ صرف مشرقی فلسفے سے ہی نہیں، بلکہ مغرب کے فلسفے سے بھی واقف تھے۔

ان کے ہاتھ میں انگریزی کی ایسی کتابیں میں نے دیکھیں کہ انگریزی کے بڑے بڑے ماہر تک انھیں سمجھ نہیں سکتے تھے، لیکن وہ پوری طرح سمجھتے تھے۔ مولانا اگر سیاسی میدان میں نہ آتے تو تاریخ و ادب میں ان کا درجہ اتنا بلند ہوتا کہ صدیوں ان کی یاد رہتی۔

مشہور کمیونسٹ لیڈر اے، کے، گوپالن!

"میں مولانا آزاد کی صفات سے اس وقت واقف ہوا، جب میں کانگریس میں تھا۔ جب بھی کوئی مشکل آپڑتی، مولانا آزاد ہی اسے حل کرتے۔"

جمعیۃ علماءِ ہند کے مشہور رہنما اور خطیب مولانا احمد سعید

"مولانا ابوالکلام آزاد صرف علومِ مذہبی کے متبحر، جلیل القدر اور بلند پایہ عالم ہی نہ تھے، بلکہ میدانِ سیاست کے بھی وہ ایک بہترین شہ سوار تھے۔

وہ بڑے اُلجھے ہوئے معاملات اپنی خداداد تدبیر، ہوش مندی اور دانش وری سے سُلجھا دیا کرتے تھے، وہ سیاسی سوجھ بوجھ میں بے مثل اور بے نظیر تھے۔ وہ ادب میں ایسے بے مثل ادیب تھے کہ ان کی تقریر و تحریر کا جواب ان کی زندگی میں کسی دوسرے انسان سے بن نہ آسکا۔
اَب دُنیا اِس شہ سوارِ علم و فن کو مدتوں روتی رہے گی۔ اور اس کا کوئی دوسرا ہمسر نہ پاسکے گی۔ میدانِ جنگ میں ان کے سیاسی تھپیڑوں نے لارڈ اروِن اور لارڈ ویول کو عاجز و درماندہ کردیا تھا"

حافظ محمد ابراہیم سابق وزیرِ ہند

"مولانا کے پاس سب سے بڑی چیز علمیت تھی۔ اس کی نسبت مجھ جیسا جاہل کہہ ہی کیا سکتا ہے۔ پھر بھی اتنا ضرور عرض کرنے کی جراءت کرتا ہوں کہ اُن جیسا اس زمانے میں کوئی اور نہیں تھا۔ زمانہ مدتوں اَب ایسا کوئی اور پیدا نہیں کرسکے گا"

بھارت کے مشہور رہنما راج گوپال آچاریہ

"ہم ہندوستان کی سیاست میں ایک عظیم اور بے مثل ہستی سے محروم ہو گئے ہیں۔"

مسز ارونا آصف علی

"مولانا کی گوناگوں اور درخشاں شخصیت علماء اور عوام دونوں ہی کے لئے سرچشمۂ فیض تھی۔"

ماسٹر تارا سنگھ

"وہ ایک عظیم عالم، ایک عظیم منتظم اور ایک عظیم سیاست داں تھے، ہر مشکل سے مشکل مسئلہ کو چند لمحوں میں حل کر دیتے تھے۔"

پنڈت سندر لال

"ظلمت و تاریکی کے اس دور میں مولانا کی ذات مشعلِ ہدایت و رہنمائی تھی۔ گاندھی جی کے بعد مولانا ہی کی شخصیت ایسی تھی جس کی طرف ہم مشکل کے وقت رجوع کرتے تھے۔"

سابق شاہ افغانستان، ظاہر شاہ

"مولانا مرحوم مشرقی ممالک کے تعلقی افق کے نمایاں ستارے تھے، مولانا آزاد کی وفات سے ہندوستان کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔ یہ نقصان ہندوستان کے دوستوں اور علم کے شیدائیوں کے لئے بھی بڑا نقصان ہے"

سابق صدر پاکستان سکندر مرزا

"اسلامی ادیب عالم کی حیثیت سے ان کا مقابلہ چند ہی لوگ کر سکتے تھے۔ وہ اعلیٰ درجہ کے انسان تھے"

سابق وزیر اعظم برطانیہ میکملن

"میں جانتا ہوں کہ دنیا بھر کے وہ تمام لوگ جو مولانا آزاد کو، جانتے ہیں، ان کے مشورے اور دوستی سے محروم ہونے کو بہت محسوس کریں گے"

سابق وزیر تعلیم مصر

"مولانا ابوالکلام کی جدائی ساری دنیا کیلئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے"

ترکی کے مشہور عالم پروفیسر فواد کبیر

"مولانا آزاد مشرق و مغرب کے ثقافتی علوم کا خزانہ تھے، اور جنگِ آزادی کے ہیرو"

سابق وزیر تعلیم افغانستان

"مولانا کی وفات سے تمام دنیا میں علم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے"

سابق صدر و وزیر اعظم افغانستان سردار محمد داؤد خان

"مولانا ابوالکلام آزاد بہت بڑے سیاست داں اور سرکردہ دانش ور تھے"

پختون رہنما خان عبدالغفار خان مرحوم

"مولانا ابوالکلام آزاد کی موت، عالمِ اسلام کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کا سہرا، مولانا اور ان کے ساتھیوں کے سر ہے"۔

حکومتِ چین کی تعزیت

" چین کے عوام کے لئے، آج صدمہ کا دِن ہے۔ وہ اپنے ایسے ہمدرد سے محروم ہوگئے ہیں، جس نے ہر مشکل وقت میں ان کی حمایت کی۔

چین پر جاپان کی جارحیت کے خلاف انھوں نے بحیثیت صدر کانگریس، آواز بلند کی۔

انقلابِ چین کی انھوں نے پُرزور حمایت کی۔

اقوامِ متحدہ کے ادارے، یونیسکو میں انھوں نے، سب سے پہلے چین کی نمائندگی کی آواز اٹھائی۔

ہمارے سر اِس عظیم انقلابی اور عوام کے دوست کے سامنے خمیدہ ہیں۔"

(وزارتِ خارجہ چین کا بیان)

مشہور ماہرِ تعلیم خواجہ غلام السیدین

مولانا آزاد کا ذکر کن الفاظ میں کروں - اور جذبات کی یورش کو کس طرح دماغ کا تابع بناؤں۔ ان کی عظمت کا اندازہ تو اس وقت ہوگا، جب وقت تاریخ کی سخت گیر کسوٹی پر، ان کے ہم عصر مشاہیر کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو پرکھے گا

ہم لوگ جو پہاڑ کے دامن میں اپنی زندگی گذارتے رہے ہیں، کیا اندازہ کرسکتے ہیں اس کی بلندی کا، اس کی برف پوش چوٹیوں کا، جن پر

سکون کی ابدی کیفیت چھائی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے دل کی شورشوں کا، جن میں لاوا کھولتا رہتا ہے۔ ان طوفانوں کی یورش، اور بجلیوں کی تڑپ کا جو اس کی آغوش میں پلتی ہیں، یا جواہرات کے ان خزانوں کا، جو اس کے سینہ میں پوشیدہ ہیں۔

میں نے اس جمِ غفیر میں، جو ۲۲ فروری کو ان کے مکان کے گرد جمع تھا، ایک بوڑھے سکھ کو یہ کہتے سُنا کہ :-

"ارے آزاد نے تو بادشاہت کی ہے بادشاہت!"

ایک معنیٰ میں یہ بالکل سچ ہے۔ وہ دل و دماغ کے بادشاہ بھی تھے، اور حکومت کی پالیسیاں بنانے اور ڈھالنے میں ان کا جو حصہ تھا اور ان کے ساتھی ان کی رائے اور فیصلوں کی جو قدر کرتے تھے، اس کے پیشِ نظر، اس بوڑھے کا یہ قول بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہ بادشاہ، جس میں ایک انتہائی خودداری اور خودی کا احساس تھا، جو کبھی کسی قوت کے آگے سر نہ جھکاتا تھا، ایک فقیر بھی تھا۔ اس فقیر کے پاس متاعِ دنیا میں سے بہت کم تھا۔ نہ مال، نہ دولت، نہ جائیداد، نہ سرمایہ، نہ خانگی زندگی کی وہ پابندیاں، جو دل میں کمزوری پیدا کرتی ہیں، اس میں بے نیازی کی ایک خاص شان تھی، اور نام و نمود اور شہرت پسندی سے نفرت۔ کبھی کسی انجمن، کسی درس گاہ، کسی عمارت کو اپنے نام سے منسوب نہیں ہونے دیا۔ یونیورسٹیوں کی اعزازی ڈگریاں قبول نہیں کیں۔ تاریخِ پیدائش تک پوشیدہ رکھی کہ دوست اور عقیدت مند اس کو منانے نہ لگیں۔

مولانا آزاد نے جہاں ایک شاہانہ شخصیت اور شاہانہ اندازِ فکر و عمل پایا تھا، وہاں ان کے دل میں عام لوگوں، اور غریبوں، اور

سماج کے ستائے ہوئے طبقوں کے لئے، خاص ہمدردی اور گداز بھی تھا۔ جس کے افسانے زبانِ خلق مدتوں تک سنائے گی۔

لیکن اس کی ایک انوکھی جھلک آپ کو اس انتساب میں دکھائی دیگی، جو انھوں نے ۱۹۳۱ء میں، اپنے علمی اور مذہبی شاہکار "ترجمان القرآن" کے لئے لکھا تھا ــــــ

اس زبردست تصنیف کو انھوں نے نہ کسی رئیس کے نام منسوب کیا نہ کسی بڑے عالم کے، نہ کسی دوست کے، نہ کسی عزیز کے۔

بلکہ ایک غریب، گم نام، اجنبی کے نام، جوان کے پاس ایک دوسرے دیس سے سیکڑوں میل پیدل چل کر، علم اور دینی ہدایات حاصل کرنے آیا تھا۔

اس مردِ مومن میں خدا کی فیاضی کی ایک عجیب شان نظر آتی ہے، اسے قدرت نے کیا کچھ نہیں دیا:

- وجاہتِ ظاہری جو اسے لاکھوں میں ممتاز بناتی تھی۔
- دماغ کی تابانی، جو فکر و عمل کے تاریک گوشوں کو منور کرتی تھی۔
- دل کی فراخی، جس میں تعصب کے سوا سب کے لئے جگہ تھی۔
- علم کی وہ فراوانی کہ حدوں تک کا پتہ نہ چلے۔
- تحریر و تقریر کا وہ کمال، جو اس کی زندگی میں ہی فسانہ بن گیا۔
- زبان کو اس نے ایک نئی قدرت اور نیا انداز بخشا ــــــ اور لفظوں سے کام لیا شعلہ و شبنم کا ــــــ رزم اور بزم کا ــــــ پھول اور تلوار کا۔

- مذہب میں اس کی وہ نظر تھی کہ اس کے آئینہ میں دین اور دُنیا کی واضح تصویر نظر آتی تھی ——— اور
- فکرِ حاضر سے ایسی واقفیت کہ مغرب کے عالم بھی اس کا لوہا مانتے تھے۔

★ یہ تھے مولانا آزاد ——— !!!

وُہ اپنی ذات سے اک انجمن تھا

- "He had become an institution in the national life of India". — J.B. Kripalani
- "He belonged to the masses, but he was always in a class by himself." - *The Leader*, Allahabad.
- "اُن کی زندگی کے ماہ و سال میں، ہماری قومی تاریخ ... تحلیل ہوگئی ہے۔" خواجہ احمد فاروقی
- "He was a great representative of Indian culture which in its essence excludes nothing that is valuable and worth having and absorbs what is good, noble and beautiful artistically, normally and spiritually". Rajendera Prasad.
- "Maulana Azad was very much more than a great nationalist. He was a great man, almost an institution by himself. — *The Assam Tribune*, Gauhati.

مولانا آزاد ایک ایسی نادر شخصیت تھے، جن کے انوار نے ہماری نگاہوں کے ہاتھ میں علم و آگاہی کی مشعلیں دے کر ایک طرف اسلاف کرام کے عہد مسعود کا ٹھیک ٹھیک مشاہدہ کرایا، دوسری طرف آئندہ منزلوں کے سنگ ہائے میل موقع بہ موقع نصب فرمادیئے" ——— (غلام رسول مہر)

" اُن کی موت ایک عظیم انسان ہی کی موت نہیں، ایک فقید المثال ادارہ کی موت ہے"
——— (چٹان، لاہور)

اُس انسانی پیکر میں علم و فضل کی ایک وسیع دنیا آباد تھی۔ علم و فضل کی اس وسیع دنیا کا اجڑنا کوئی معمولی بات نہیں ہے" ——— (مشفق خواجہ)

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم تفسیر ترجمان القرآن، ابھی تک ۱۸ پاروں میں سورۃ المومنون تک شائع ہوئی ہے۔

تیس ۳۰ پاروں تک بقیہ سورتوں کی تفسیر کی اشاعت حضرت مولانا کی بار بار کی قیدِ فرنگ، ملک کی آزادی، تقسیم اور بعد کے سنگین حالات میں مولانا کی زبردست مصروفیات کی وجہ سے، عمل میں نہیں آسکی۔

اشاعت کے اس طویل التوا کی وجہ سے، یہ فرض کر لیا گیا کہ بقیہ سورتوں کی تفسیر حضرت مولانا نے لکھی ہی نہیں ہے۔

حالانکہ، ترجمان القرآن جلد اول کے دیباچہ میں صاف طور سے حضرت مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ:

"اور ۲۰ جولائی ۱۹۳۰ء کو آخری سورۃ کے ترجمہ و ترتیب سے فارغ ہوگیا۔"

الحمد للہ، مولانا کی تفسیر کا یہ باقی حصہ موجود ہے۔ اس کی طباعت کے لئے، میں نے اپنے لاہور کے قیام کے دوران، مولانا غلام رسول مہر سے سامان کرانا چاہا، لیکن افسوس کہ میری متعدد بار کی کوششوں کے باوجود، میرے اور ان کے درمیان

مستقل رابطہ قائم نہ ہوسکا۔

مولانا کی غیر مطبوعہ تحریروں کی طباعت کے لئے، جن کا ایک بڑا ذخیرہ، میرے علم میں تھا، مولانا غلام رسول مہر مرحوم سے، میری جو مختصر سی خط و کتابت ہوئی، اس کا یہاں درج کر دینا، ایک یادگار کے طور پر، مناسب ہوگا اور نمونتہً چند ایک مقامات، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بقیہ تفسیر سے پیش کئے جا رہے ہیں۔

مہر صاحب کے مکتوبات آخر میں ملاحظہ فرمایئے۔

سورۂ "نور" کے ترجمہ و تفسیر کا ایک نمونہ :-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے، اور اعمالِ صالحہ اختیار کئے، ان لوگوں سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین پر خلافت عطا فرمائے گا۔ جیسے کہ ان سے پہلے (بعض اُمتوں کو، خلافت عطا فرمائی تھی) اور جو دین (یعنی اسلام) اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے، اسے دنیا میں

ضرورت قائم کرے گا۔ اور ان کے موجودہ خوف کو طمانیت سے بدل دیگا۔ تاکہ وہ (بہ اطمینان) اللہ کی پرستش کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ گردانیں۔

سورۂ "فرقان" سے ایک نمونہ :-

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○

خدائے رحمٰن کے (سچے بندے) تو وہی ہیں جو زمین پر (کبر و غرور کے ساتھ نہیں بلکہ) فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب جاہل لوگ ان سے (جہالت کے ساتھ بات کرتے ہیں (یعنی کٹ حجتی کرتے ہیں) تو وہ "سلام" (یعنی معاف کیجئے) کہہ کر (الگ ہو جاتے ہیں)۔

سورۂ "شعراء" سے ایک نمونہ :-

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۙ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۗ

وہ دن، جب نہ مال کام آئے گا نہ اہل وعیال۔ (یعنی کوئی مادی شے فائدہ نہیں پہنچا سکے گی) مگر ہاں جس نے قلبِ سلیم کے ساتھ اللہ تک رسائی حاصل کر لی، وہ ضرور کامیاب ہو گا ۞

سورۂ "عنکبوت" سے ایک نمونہ :-

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○

دُنیا کی یہ زندگی، لہو ولعب کے سوا اور کیا ہے۔ اصل زندگی تو آخرت (کی زندگی) ہے۔ کاش لوگ (اسے اچھی طرح) جان لیتے۔

سورۂ "حٰمٓ سجدۃ" سے ایک نمونہ :-

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ؁	باطل نہ تو اس (قرآن) کے آگے کھڑا رہ سکتا ہے، نہ پیچھے جگہ پا سکتا ہے۔ وہ حکیم وحمید (خدا)

کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

سورۂ "زخرف" سے ایک نمونہ :-

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ إِنَّنِي بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ ۞ إِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي فَإِنَّهُ سَيَهْدِينِ ؁	اور جب ابراہیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا کہ جن چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ (ہاں)

مگر جس ذات نے مجھے پیدا کیا ہے، وہی (ذات) میری رہنمائی فرمائے گی:

سورۂ "جاثیہ" سے ایک نمونہ :-

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ؁	آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ سب کا سب، اللہ تعالیٰ نے تمھارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ بلاشبہ غور و فکر سے

کام لینے والے لوگوں کے لئے اس میں معرفت کی بڑی نشانیاں ہیں۔

سورۃ "فتح" سے ایک نمونہ :-

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ؕ وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ

وہ اللہ ہی تو تھا، جس نے مسلمانوں کے دلوں میں اطمینان کی رُوح پھُونک دی تاکہ ان کی قوتِ ایمان میں تازگی کا اضافہ ہو جائے۔

آسمانوں کے اور زمین کے تمام لشکروں کی باگ ڈور اللہ کے ہی ہاتھوں میں ہے۔ بے شک اللہ کی ذات علیم و حکیم ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ایک ایسے معاشرہ کے قیام کی کوشش کی، جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حد بندیوں سے بالاتر ہو ــــ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ شروع کے چالیس برسوں کو، یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کو چھوڑ کر، کبھی بھی سارے مسلمان ممالک صرف اسلام کی بنیاد پر متحد نہیں کیے جاسکے"

• انڈیا ونز فریڈم سے ایک اقتباس •

پوسٹ کارڈ
پتہ
PAKISTAN
5 PAISA POSTAGE

باسمہٖ سبحانہٗ

۹ر جنوری ۱۹۶۶ء

مجھے افسوس ہے کہ آپ اس روز آئے، جب میں اتفاقیہ یونیورسٹی کی ایک میٹنگ میں گیا ہوا تھا، بے حد افسوس ہوا۔ میں عموماً گھر سے باہر نہیں جاتا۔ صرف ہفتہ کا دن اس غرض سے مقرر ہے اور اس روز میرا باہر جانا میرے ہر دوست کو معلوم ہے۔

بہرحال آپ اگر دوبارہ زحمت فرماسکیں تو مجھ پر احسان ہوگا۔ میں خود بھی آسکتا ہوں، لیکن جس کام کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، غالباً اس کے لئے گفتگو غریب خانۂ احقر ہی پر مناسب ہوگی۔

اتنا اور عرض کردوں کہ میرے لئے، اس غرض سے اتوار کا دن زیادہ موزوں ہوگا۔ اس روز مجھے اپنے کام سے فرصت ہوتی ہے، باقی دنوں میں میرا محرر نو بجے کے قریب آجاتا ہے، اور ایک بجے تک مسلسل کام ہوتا ہے اس دوران میں فارغ البالی سے گفتگو نہیں ہوسکتی۔

اتوار کو آپ دس بجے کے قریب بھی تشریف لے آئیں تو دو گھنٹے ضروری گفتگو ہوسکے گی۔

امید ہے آپ بخیر ہوں، میں دوبارہ معذرت کرتا ہوں کہ آپ آئے اور میں گھر پر موجود نہ تھا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

نیازمند

مہر

باسمہٖ سبحانہٗ

۱۴ جنوری ۱۹۶۹ء

مکرمی۔ عرض جواب میں تاخیر کا ذمّہ دار بھی میں ہوں۔ بعض اوقات عجب اتفاقات پیش آجاتے ہیں۔ وہ تحریر مجھے دوسرے روز کتابوں میں ملی۔ پھر دوست آگئے، اور میں اس پر سرسری ہی سی نظر ڈال سکا۔

اسے اطمینان سے پڑھا، اور اصل حقیقت ذہن نشین ہوئی، تو خیال آیا کہ اپنے بھتیجے کو بائیسکل پر آپ کے پاس بھیجدوں۔ آخر سوچا کہ پہلے معلوم تو کرلوں، آپ سے ملاقات کا امکان بھی ہے، یوں دو روز کی تاخیر ہوگئی۔

آپ لطفاً ۲۷ جنوری کو مراجعت پران صاحب سے ربط پیدا کریں۔ میں مکاتیب ایک نظر دیکھ لوں تو عرض کرسکوں کہ ان کے چھپنے کی کیا کیا صورتیں ہوسکتی ہیں۔

اگر ترتیب و تقدیم میں میری ناچیز خدمات مطلوب ہوں تو غالباً یہ عرض کرنا غیر ضروری ہے کہ وہ بے تامّل حاضر ہوں گی۔ میرا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ مولانا کی ہر تحریر شائع ہوجائے۔ کیمبل پور میں ایک صاحب کے پاس بارہ مکاتیب تھے، وہ انھوں نے چھاپ دیئے ہیں۔ مجھے لکھا تھا کہ تمہیدی سطریں لکھ دوں۔ وہ میں نے لکھ دیں۔ لیکن کئی روز سے ان کی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ ان صاحب کے پاس جو مخطوطات ہیں، ان کے نام ہی معلوم ہوجائیں تو بڑا احسان ہوگا۔

یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہُوئی کہ آپ کو مولانا کے خاندان سے قریبی تعلق ہے۔ میں پہلے یہی سوچ رہا تھا کہ یہ شیفتگی تو خصوصی ربط کے بغیر نظر نہیں آسکتی۔ عرفی نے کہا تھا ؂

زمانہ اہلِ دلے نیست من نمی دانم
کہ بوئے دِل زِکدامیں دیار می آید

اَب معلوم ہُوا کہ دِل کی خوشبُو کہاں سے آتی تھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ شرفِ ملاقات مجھ عاجز و ہیچ میرز کے لئے باعثِ افتخار ہو گا۔ والسلام علیکم

مہر

باسمہٖ سُبحانہٗ

مُسلم ٹاؤن۔ لاہور
۲۵ر جنوری ۱۹۶۶ء

مکرمی۔ مولاناؒ اکثر نظیریؔ کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے، اور غالباً "الہلال" میں بھی یہ ایک سے زیادہ مرتبہ نقل ہُوا ہے ؂

جز محبّت ہر چہ بردم، سود در محشر نداشت
دین و دانش عرضہ کردم، کس بہ چیزے برنداشت

مولانا کا ہم زبان ہونے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ نظیریؔ کا دُوسرا شعر سُنا کر گذارش ختم کرنا چاہتا ہُوں ؂

نازم بہ ایں شرف کہ غلامِ محبّتم
لافِ نسب بہ نسبتِ آدم نمی زنم

اس عریضے کا مدعا محض یہ ہے کہ مجھے دو چار روز میں، دو چار دن کے لئے راولپنڈی جانا ہے۔ غالباً ۵ فروری تک واپس آجاؤں گا۔ آپ ۲۷ کو مراجعت فرما ہوں گے۔ میں یہ گذارش اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ میری عیشِ حاضری میں آپ کو کلبۂ احزان تک آنے کی زحمت نہ ہو۔ میں واپسی کی اطلاع یہاں آکر دے دوں گا بھر بقول نظیری ؎

چناں با دوست آویزم، بہ دل گرمی و دم سازی
کہ در ہنگامِ جانبازی، بہ دشمن، دشمن آریزر

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا

مہر

باسمہٖ سبحانہٗ

۱۹ فروری ۱۹۶۶ء

مکرمی ؎

بروز وصل در آغوشم آنچناں بفشار
کہ بے من از لب من شکوۂ تو دا ریزد

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مہر

نمبر ۲۲ (۲۲ قائد اعظم ؟)

جناب ایچ ایم عباسی قیامِ پاکستان سے قبل "سٹار آف انڈیا" اور "ڈان" سے وابستہ رہے۔ پاکستان آکر "سندھ آبزرور" سے وابستہ ہوئے۔ "ڈان" کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن بنے۔ انگریزی اخبار "کومنٹ" کے ایڈیٹر رہے۔ "ڈیلی نیوز" میں لکھتے رہے۔ ابتدا سے مسلم لیگ میں شامل ہوگئے تھے۔ قائد اعظم اور دوسرے مسلم لیگی اکابر سے بالکل قریب تھے اور مسلم لیگ کی مرکزی کاروائیوں اور پالیسیوں کی تشکیل میں حصہ لیتے رہے۔ ہفت روزہ "اخبارِ جہاں" کراچی کے شمارہ ۱۶ جنوری ۱۹۷۴ء میں ان کا ایک اہم مقالہ شائع ہوا ہے جس کا ایک اقتباس ذیل میں ملاحظہ فرمائیے :-

"میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد جہاں جاتے جس طبقے سے بات کرتے، اس کو کانگریس پارٹی کا ہمنوا بنا لیتے۔ حمید اللہ والیٔ بھوپال نے اکثر رجواڑوں کو مسلم لیگ کا ہمنوا بنانا چاہا، اور ایک حد تک کامیاب بھی رہے لیکن لیگ کی لیڈر شپ کی طرف سے ان کی ہمنوائی نہ ہو سکی، اقلیم ہندوستان کی ساری قومیں، کاسٹ ہندو۔ اچھوت جن کی تعداد تقریباً چھ کروڑ تھی، عیسائی، سکھ۔ بدھ۔ جین۔ پارسی۔ سارے کے سارے کانگریس کے ہمدرد تھے لیگی مسلمانوں کی ڈپلومیسی ایسی فرسودہ۔ ناکارہ اور بچر تھی کہ ہمیشہ وہ یکہ و تنہا ہی رہے۔ مشرقی پنجاب کا قتلِ عام اور لنگڑا لولا پاکستان ایسی ہی نالائقی کے نتائج تھے۔

الٰہ آباد یونیورسٹی میں ایک صاحب میرے کلاس فیلو تھے یگتی کے پٹھان تھے ان کا نام اجمل خاں تھا۔ مجھ سے عمر میں زیادہ تھے مگر تفریح اور شکار کا شوق تھا لہٰذا لکھنے پڑھنے میں وقت کم دیتے تھے۔ میں پڑھنے اور امتحان میں اکثر ان کی مدد کرتا تھا۔

میں ۱۹۴۰ء میں کلکتہ آگیا تھا اور کچھ دنوں کے بعد "اسٹار آف انڈیا" کا رکن مدیر ہوگیا تھا۔ کہاں میں اور کہاں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد۔ ایک تو میں ناچیز اور دوسرے یہ کہ مسلم لیگی اخبار کی ادارت کا کلنک کا ٹیکہ میرے سر پر تھا۔ اور دوسری طرف حضرت مولانا، صدر کانگریس اور اپنے طرزِ زندگی میں بے حد محتاط اور ضرورت سے زیادہ متین۔ مولانا کا بنگلہ، محلہ بالی گنج، کلکتہ میں باہر سے بہت معمولی، مگر اندر سے بہت سجا ہوا تھا۔ کتابیں تو میرے خیال میں پچاسوں ہزار تھیں۔ مولانا کا اپنا کمرہ کافی بڑا تھا۔ اندر دو ڈبل بیڈ تھے۔ دیواروں سے لگی الماریاں تھیں جن میں کتابیں بھری تھیں۔ ایک بغل میں میز تھی۔ کئی کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی رہتی تھیں۔ میں نے مولانا کو ہمیشہ بیڈ پر بیٹھے دیکھا۔ چاروں طرف بیڈ پر کتابیں پھیلی ہوتیں۔ پانچ چھ چین کا پرانے اسٹائل کا سادہ کافی اور ماچس ضرور ہوتا تھا۔ مولانا کبھی کبھی چائنیز چائے بغیر دودھ کی پیتے تھے۔ باہر اکثر و بیشتر قیمتی موٹریں کھڑی رہتی تھیں۔ کلکتہ سے اور سارے ہندوستان سے کانگریسی لیڈران سے ملاقات کو آتے رہتے تھے۔ مولانا ملاقات کرنے میں کافی کنجوس واقع ہوئے تھے۔ بڑے بڑے لوگ دو دو گھنٹہ بیٹھتے تھے تب کہیں پیشی ہوتی تھی۔

اجمل خاں مولانا کے پرائیویٹ سیکرٹری ہوگئے اور میں ان کے پاس جانے لگا۔ ان کی مہربانی سے وہ کبھی مجھ کو اندر کر دیا کرتے تھے اور کہہ دیا تھا کہ گو گم کردہ راہ ہے، مگر میرا بہت دوست ہے۔ مولانا سے میری اکثر گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں۔ وہ سخت متعصب کانگریسی تھے۔ مسلم لیگ اور نظریۂ پاکستان کے جانی دشمن۔ ان کا خیال

نہیں بلکہ ایمان تھا کہ یہ تحریک مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے تخلیق کی گئی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ میں یوپی کا ہوں لہٰذا وہ مجھ پر زیادہ برستے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو یا عیسائی تعلیم انتظامی کارکردگی، سیاسی ہنرمندی، اقتصادی و تجارتی کارگزاری میں مسلمانوں سے پچاس برس آگے ہیں۔ لیکن مسلمان ترقی کر رہے ہیں۔ آئندہ پچاس سال میں برابر ہو جائیں گے۔ پاکستان کا سحران اقلیتی صوبوں کا پیدا کیا ہوا ہے لیکن پاکستان ایسے صوبوں میں بن رہا ہے جو محض کر کے پس ماندہ ہیں۔ جہاں انگریزوں نے بہت سختی کی تھی۔ لہٰذا نہ وہ سیاسی ترقی کر سکیں گے اور نہ اقتصادی۔ رہا اقلیتی صوبوں کے مسلمان تو وہ بے موت مارے جائیں گے۔ وہ ابد تک ہندوؤں کے انتقام کے شکار ہوں گے۔ اور پاکستان چوں کہ مفلس، کمزور اور سیاسی پس ماندگی کا شکار ہو گا لہٰذا وہ ان کی کوئی مدد بھی نہ کر سکے گا۔ ان میں سے کتنے مسلمان، پاکستان جا سکیں گے۔ ۵ لاکھ، ۱۰ لاکھ، ۱۵ لاکھ، ۲۰ لاکھ اتنے سے محدود اشخاص کے لئے تم لوگ دس کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کو خراب کر رہے ہو۔ اور بہت سی باتیں حضرت مولانا نے فرمائی تھیں جو کبھی پھر عرض کروں گا!

مولانا ابوالکلام آزاد کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے اکثریتی صوبے پاکستان نہیں چاہتے۔ اقلیتی صوبوں کے مسلمان، ان پر زبردستی یہ عذاب ٹھونس رہے ہیں۔ پٹیل کے خطوط کی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اس میں سندھ کے اکثر مسلمانوں کے لیڈروں کے خطوط ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پاکستان نہیں چاہتے تھے۔ صوبہ فرنٹیر میں کانگریسی حکومت قائم تھی، پنجاب میں بھی، معاملہ یہی تھا۔ زمیندارہ کلاس چاہے ہندو ہو، سکھ ہو یا مسلمان ہو سکندر حیات، خضر حیات ٹوانہ اور چھوٹو رام کے ساتھ تھا۔ صرف شرپجگال نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اس کا یہ حشر ہوا؟

(بشکریہ: اخبار جہاں کراچی) •

شورش کاشمیری

عجب قیامت کا حادثہ ہے کہ اشک ہیں آستیں نہیں ہے
زمیں کی رونق چلی گئی ہے، اُفق پہ مہرِ مبیں نہیں ہے
تری جدائی میں مرنے والے وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے

مگر تری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

اگرچہ حالات کا سفینہ، اسیرِ گرداب ہو چکا ہے
اگرچہ منجدھار کے تھپیڑوں سے قافلہ ہوش کھو چکا ہے
اگرچہ قدرت کا ایک شہکار آخری نیند سو چکا ہے

مگر تری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

کئی دماغوں کا ایک انساں، میں سوچتا ہوں کہاں گیا ہے
قلم کی عظمت اُجڑ گئی ہے، زباں سے زورِ بیاں گیا ہے
اُتر گئے منزلوں کے چہرے، امیر کیا؟ کارواں گیا ہے

مگر تری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

مجھے یقیں ہے، کنارِ جمنا سے پھر کوئی سلسلہ اُٹھے گا
گئے زمانوں کی یادگاروں سے اِک نیا ولولہ اُٹھے گا
جہاں جہاں ہم فنا ہوتے ہیں وہاں وہاں قافلہ اُٹھے گا

مگر تری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

ہماری مٹی، نئے زمانہ کے معبدوں میں اذان دے گی
ہمارے پرچم کی سربلندی کو یہ زمیں آسمان دے گی
ہمارے اجسام پر جو بیتی ہے خاکِ دہلی نشان دے گی

مگر تری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

یہ کون اُٹھا کہ دیر و کعبہ شکستہ دِل خستہ گام پہنچے
جھکا کے اپنے دلوں کے پرچم، خواص پہنچے عوام پہنچے
تری لحد پر خدا کی رحمت، تری لحد کو سلام پہنچے

مگر تری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقین نہیں ہے

(مولانا کے مزار پر لکھے گئے)

۱۰- مارچ ۱۹۵۸ء

روحِ آزاد!

محو گریہ ہے خرد اور جنوں چپ چپ ہے
منصفِ وقت کے ماتھے کی شکن ڈوب گئی
گلشنِ دہر میں ہر سمت خزاں چھائی ہے
جگمگاتے ہوئے سورج کی کرن ڈوب گئی

آج پھولوں میں لطافت، نہ فضاؤں میں سرور
چھپ گیا وقت کے ماتھے کا چمکتا خورشید
مجھ سے کہتی ہے زمانے کی فسوں ساز نظر
ہے زوالِ غمِ انساں کی یہ پہلی تمہید

سوگواری ہے قیادت کے صنم خانوں میں
اٹھ گیا زہد و تقدس کی پرستش کا وقار
شام کے ساتھ شفق رنگ نظارے ڈوبے
اب چراغوں میں تجلی ہے نہ شاخوں پہ بہار

آئینہ ٹوٹ گیا، سر بگریباں ہے نظر

چل بسا ہائے تخیل کا، تصور کا امام!
آدمیت کے مقامات کو نیند آ ہی گئی
روح آزاد تجھے وقت کے شاعر کا سلام

—O—

سسکیاں ہیں کہ اُٹھ آئی ہیں طوفاں کی طرح
کوئی بھی شے دلِ پرغم کو نہیں بہلاتی
اے خداوند مکافات! دہائی ہے تری
کاش آزاد کے بدلے مجھے موت آ جاتی

(ساغر صدیقی)